ناول ایجنسی لاہور کی ادبی کتابوں کے سلسلہ میں نمبر اول

ایشیائی شاعری

از تصنیف لطیف جناب مولینا سید امجد علی صاحب اشہری

جسے
ناول ایجنسی لاہور نے
بحقوق تصنیف دائمی
پہلی مرتبہ ۱۹۱۷ء میں
اپنے حافظ آبادی پریس لاہور میں طبع کیا

سخن اک رمز ہے کشفِ اسرارِ معانی کا — ادب اک آئینہ ہے جلوہ گاہِ لن ترانی کا
کہاں تک پاسبانی ہاری کیجیا اور وہ بھی خصلت سے — زمینِ شعر پر قبضہ ہے دورِ آسمانی کا
گل و بلبل کے افسانے نہیں تفسیر حکمت کے — چھپا الفاظ کے اندر خزانہ ہے معانی کا

جو ڈھونڈو گے تو پاؤ گے جو سمجھو گے تو جانو گے
کہ ہم کو اک نگینہ مل گیا عہدِ کیانی کا

گل و بلبل میں جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
خود بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

ہندوستان کی عام زبان اردو تسلیم کی جاتی ہے - مگر ہندو صاحبوں نے ہندی کو رواج دینے میں بہت بڑی کوششوں سے کام لیا - حالانکہ خود ہندوؤں کا ہر مہذب گروہ اردو بولتا اور اردو لکھتا پڑھتا ہے اور اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان نہیں بلکہ یہ سب قوموں کی مشترکہ زبان ہے - نتیجہ یہ ہوا کہ انگلش گورنمنٹ نے سررشتہ تعلیم اور عدالتوں میں اردو اور ہندی دونوں کے رواج و تعلیم کو داخل کر دیا - جب ایسا ہوا تو ہندوؤں کی آنکھیں کھلیں اور ایک گروہ کو مدرسوں میں بند ہوا پایا - نفاق اور تعصب کے یہی نتائج ہیں جو ہندوستان کا ستیاناس کر رہے ہیں آخر کار مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ہندو ہندی کی اشاعت میں سرگرم ہیں

اور ہندی اردو کو دبانا اور اس کی فصاحتوں کو بگاڑنا چاہتی ہے تو اردو کی حفاظت کا سامان کیا اور مسلمانوں کے اجلاس محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس دہلی سنہ ۱۹۰۳ء (زمانہ دربار شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ملکہ) میں ایک خاص کمیٹی اردو کی حفاظتوں کو قرار پائی۔ اور مولانا شبلی صاحب نعمانی سابق پروفیسر عربی مدرسۃ العلوم علیگڈھ حال ناظم دینیات حیدرآباد اس کے سکرٹری قرار پائے اور ضروری علوم و فنون کی تدوین پر خیالات رجوع ہوئے ازاں جملہ یہ کتاب بھی توسیع ذخیرۂ معلومات اردو کی غرض سے پیش کیجاتی ہے۔ اس کے دیکھنے سے بعض پرانے خیالات کی نسبت فلسفیانہ جانچ کا موقع ملے گا اور مغربی علوم کے تعلیم یافتہ ایک حد تک اپنے مشرقی مذاق اور اس مذاق کے اسباب و علل سے واقف ہو سکیں گے۔

نظم

مشرقی ادب

تباہ حال ہے ہندوستان میں لٹریچر
بہار کا نہیں پاتے ہیں اس چمن میں گذر

پڑے اجاڑ ہیں جو تھے ہرے بھرے گلشن
پرانے جڑ سے اکھاڑے جو تھے قدیم شجر

ہیں بلبلوں کی جگہ چند تتلیاں اڑتیں
نسیم صبح کے گھر میں ہے چل رہی صرصر

ہیں نونہال چمن علم سے پھلے پھولے
مگر مٹھاس ہم کا پاتے نہیں پھلوں میں اثر

ہر ایک باغ میں ہے اک نئی ہوا چلتی
چمن میں پھول ہیں لیکن بہار ہے باہر

نہ ہندوؤں میں نظر آئے بالمیک کوئی
نہ ہم میں ہیں متنبی و فیضی و جعفر

نہیں ہے ایک بھی تلسی کا مثل بھاشا میں
نہ پارسی میں ہے خسرو کا دوسرا ہمسر

انیس و غالب مرحوم کی جگہ کوئی
ہوئے نہ ملک میں افسوس وہ زباں آور

ہے سنسکرت زمانے میں ماں زبانوں کی
مگر ہے اب تو وہ بے کنٹھ باشِ سرتاسر

نہ ہم کو نحو و عروضِ سخن سے دلچسپی
نہ ہندوؤں کو توجہ نیائے و پنگل پر

نہ بولتے ہیں پپیہے صدائے دلکش سے
نہ قمریوں کے ترانوں میں وجد کا ہے اثر

کنول کے پھول کھلے ہیں مگر ہیں پژمردہ
بھرا ہے حوض ہیں لیکن فسردہ نیلوفر

ہزار طرح کے پھل ہیں مگر مٹھاس نہیں
ہزار رنگ کے گل ہیں مگر نہیں گل تر

ہے بالمیک کی تصنیف قالبِ بیجاں
نہ پہنچے بام پہ اسکے کمند اہلِ نظر

مصنفین میں بھاشا کے ہیں جو تلسی داس
ورق طلا کے ہیں اُن کے لکھے ہوئے بیتر

مگر بیان ہوئے جو استعارہ ہائے ادب
وہ میل کھائیں نہ انگلش مذاق سے یکسر

ادب سے پہلے تھا وابستہ دھرم کرم یہاں
نہ پاس آنے دے اسکو جدید لٹریچر

گریجوایٹ جو نکلے ہیں نیو فیشن کے
دلوں میں اُن کے نہیں اس مذاق کا ہے اثر

اسی طرح سے مسلمان بھی ہو گئے بے حس
نہیں دماغوں میں اُن کے قدیم کے جوہر

کہاں وہ لوگ جو اعجازِ خسروی سمجھیں
کہاں وہ فیضی و آزاد جیسے جاں پرور

جو نغمہ سنجِ طرب تھیں وہ اڑ گئیں چڑیاں
جو نکتہ دانِ ادب تھے وہ اڑ گئے طائر

زباں میں حس ہی نہیں ہو تو ذائقہ کیسا
نہیں مشام تو پھر کیا شمامۂ عنبر

چمن وہی ہے مگر بلبلیں نہیں ویسی
کچھ پڑے ہیں کہیں کیاریوں میں انکے پر

اثر نہ پونت میں سوتی کا ہو سکے پیدا
نہ آئیں لوہے میں فولاد کے کبھی جوہر

ہر ایک چوب نہ تاثیر میں ہے صندل
ہر ایک پھول میں آئے گلاب کا نہ اثر

دل و دماغ نہ باقی رہے ہوں جب اگلے
تو اُن سے کام بتاؤ وہ ہو سکے کیونکر

جو پہلے فضل و ادب کے تھے مقصدِ عظمیٰ
وہ اب ہیں خانہ براندازِ صاحبانِ ہنر

نہ سلطنت کو ہمارے ادب کی کچھ پروا
نہ سلطنت کی صداؤں کے ہم سخن گستر

نہ کچھ خدا سے علاقہ نہ دیوی دیوتا سے
نہ آج کام کے اوتار ہیں نہ پیغمبر

نہ راج نیتی میں اپنی زبان کا کچھ حصہ
نہ ہم فرائضِ اعلیٰ میں صاحبِ دفتر

نہ شمعِ حسنِ ازل سے لگی ہماری لو
نہ ہیں مناظرِ حسنِ کمال پیشِ نظر

اردو

میں اب دکھاتا ہوں اردو کی حالتیں تمکو
جو عام طور سے دیکھے ہر ایک اہلِ نظر

ہے ہندوؤں کیلئے گفتار یہ کلجگ کی
ہماری قوم کو دوشیزہ عالم محشر

اصول السنہ اسپر ہیں حجت ناطق
کہ اس زباں کے نہ ہو دوسری زباں ہمسر

حروف سب سے زیادہ ملے ہیں اردو کو
نہیں کسی سے الفاظ نسبتاً اکثر

زیادہ لفظوں سے جملے زیادہ ہوں پیدا
اسی قدر ہوں تکلم میں وسعتیں ظاہر

ہر ایک بیج ہے اسکی زمیں میں کھپ جاتا
ہر ایک تخم ہو نشو و نما سے بار آور

جو دیکھئے عربی سنسکرت بھاشا کو
تو ان کو غیر کی صحبت سے ہے گریز و حذر

مگر نہیں اسے کچھ دوش ان کے ملنے سے
نہ یہ تعصب مذہب کی عادتاً خوگر

نہ ایک نثر ہی مجموعۂ تکلم ہے
ہے جامعِ سخن عام نظم کا دفتر

بڑے بڑے ادبا اس کے ناقلِ معنی
بڑے بڑے حکما اسکے قابلِ جوہر

جو کام سہل ہے اسکو وہ غیر کو مشکل
جو کام غیر کو آساں وہ اسکو آساں تر

ذرا بتاؤ تو ہندی میں لکھ کے دیکھیں تو
ہوں کلیات میں جسکے یہ وسعتیں مضمر

نہ ایک جملے سے پیدا ہوں اسقدر معنی
نہ یوں تلفظ الفاظ ہو سخن گستر

عرب کے لفظ عجم کی زباں کی یہ عامل
زبانِ انگلش و بھاشا کی ناقلِ دفتر

نہ لکھ سکیں اسے اہلِ مقدمہ ایسا
نہ پڑھ سکیں اسے اہلِ معاملہ فرفر

یہی زباں ہے زمانے کے ساتھ چل سکتی
نہیں ہے جسمیں تعصب کا نام تو مختصر

نہیں ہے واسطہ خاص اسکو مذہب سے
نہ ایک مذہب و ملت کی یہ ہے بھی خوگر

انہیں وجوہ سے اغیار چاہتے ہیں یہ
کہ تو تیغ ڈالئے کلیوں کو تا نہ نکلیں پیش

کوئی زباں نہیں اسکے سوا یہاں ایسی
جو سب زبانوں میں کھپ جائے جیسے شیر و شکر

یہی زبان ہے انگلش کے ساتھ چل سکتی
اسی زبان میں ہو ہر زباں کا حشر و نشر

سوائے اسکے علوم و فنون انگلش کا
کوئی زباں نہ کرے اس سے ترجمہ بہتر

کبھی نہ نفع ہو ہندی کو دور اتفاق میں مگر لڑائی سے اُردو کا ہو ضرور ضرر
تفقہ ہے ملک اگر اشہری نہ قدر کرے
کرے گا ظلم جو اس پر وہ ہے ستم خود پر

ایشیائی شاعری

آجکل ہندوستان کے عام جلسوں میں دو متضاد خیال کے طبیعت دار پائے جاتے ہیں۔ ایک اولڈ فیشن (پرانی وضع) کے شیفتہ۔ دوسرے نیو فیشن (نئی وضع) کے فریفتہ۔

اولڈ فیشن والے سنسکرت بھاشا۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو کی شاعری اور ادب کے دلدادہ ہیں۔ نیو فیشن والے مغربی مذاق کے سامنے مشرقی خیالات اور مقالات کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ لیکن اولڈ فیشن والے بغیر صورت دکھائے حسن کی داد دیتے ہیں۔ اور نیو فیشن والے بغیر صورت دیکھے پیدا کر رہے ہیں اور دونوں کا یہ خیال کہ ہمارا مذاق سلیم ہے جدید یا قدیم زیادہ صحیح ہے غلط ہے

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط
اُس نے کہا کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

اور یہ غلطی عام طور سے ایک کو دوسرے کے مذاق کی لاعلمی اور غیر جنس کی صحبت اور ہم جنس کی عدم صحبت سے پیدا ہوتی ہے اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس جہل اور لاعلمی سے تمام مشرقی علوم اور فنون جو سینکڑوں ہزاروں برس سرمایۂ فخر و ناز رہے اور اب بھی وہ ایک ضروری استفادہ اور قدردانی کے لائق ہیں روشنی سے اندھیرے میں چھپتے جاتے ہیں۔

پس میں اس وقت سب کو چھوڑ کر **ایشیائی شاعری** کا ذکر کرتا ہوں۔

ہیئت قدیمہ میں کرہ ارض کو سات حصوں پر تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصہ

ایک اقلیم سمجھا جاتا تھا۔ جیسے اقلیم فارس۔ اقلیم ہند۔ اقلیم چین وغیرہ۔ پھر جب
فرنگ نے یورپ کے جغرافیائی ماہروں کو حاصل علم و اقبال کیا تو انہوں
نے تثلیث کے خیال سے زمین کو تین حصوں پر تقسیم کیا اُن کے نام یہ ہیں۔
یورپ۔ ایشیا۔ افریقہ۔ پھر جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا لیکن اس میں ذرا
بھی شک نہیں کہ جو حصہ ایشیا کے نام سے موسوم ہے جس میں ایران ہندوستان
چین اور ان کے ملحقات اور ترکستان و دمشق کے بڑے بڑے قدیمی نامی شہر
بغداد پائے جاتے ہیں۔ یہ حصہ دنیا کے جسم میں دل کا مقام سمجھا گیا ہے اور
جیسے دل سے تمام جسم کو شرائین اور اوردہ کے ذریعہ سے خون پہنچتا
اور وہ جسم و ارتقا کی پرورش کرتا ہے ویسے ہی اس حصۂ زمین سے تمام
دنیا فیض یاب رہی ہے۔

اب یورپ نے خود کو تمام کرۂ ارض کے جسم پر بطور دماغ کے نمایاں کیا ہے
اور گو دنیا کا دماغ طرح طرح کے علوم و فنون کی روشنیوں سے روشن ہو رہا
ہے لیکن دنیا کا دل روز بروز مرجھاتا جاتا ہے۔ اور یورپ کا دماغ ایشیا کے
خون سے پرورش پا رہا ہے۔ مگر ایشیا کو اپنے بدل ما یتحلل کی فکر نہیں۔

اور یورپ کی دماغی تعلیم ایشیا کے دل کو زندہ کرنے والی نہیں ہو سکتی جب
تک کہ ایشیا اپنی روحانی تعلیم سے اپنے دل کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے
کی فکر نہ کرے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایشیا نے اپنے زمانۂ
ترقی میں دل اور دماغ دونوں کی زندگی کے سامان فراہم کئے تھے۔ اور
یورپ نے ابھی تک صرف دماغ کو روشن کیا ہے۔ ایشیا کا ہر مذاق فلاسفی
کا ایک دفتر اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ ہمارے ابہام کا مقصود یہ ہے
جو ہم ہر بات کی تہ کو دریافت کریں۔ یورپ ہماری بات بات سے
فائدہ اٹھا رہا ہے اور ہم کو اپنی دنیا میں کسی بات سے رسوائی نہیں ہوتی۔
اور ہمارا مذاق دوسروں سے یہ کہتے سنے اپنے گھر کی ہر چیز کو برا کہنے برا جانتا

اور دوسروں کی ہر بات کو اچھا کہنے اور اچھا جاننے کا خوگر بن رہا ہے جب ہم کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہماری کوئی چیز کیوں بُری ہے اور دوسروں کی کوئی چیز کیوں اچھی ہے اور دوسرے ہماری ہر چیز کو کیوں بُرا کہتے اور اپنی ہر چیز کو کیوں اچھا بتاتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو اس تاریکی کی ایک نئی اور قابل قدر روشنی میں پائیں گے۔ اے خدا تو ہم کو اس تاریکی سے نکال اور زندہ دلی اور روشن دماغی کے سامان مہیا کر ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ابھی تو ہم ایک ایسے شیش محل میں بیٹھے ہیں جسکی زمین سونے کی اور جسکی چھت موتی کی اور جسکے در و دیوار ہو گئے ہیں۔ اور مغربی آفتاب کی جلوہ گری نے ہمارے مکان کو چاروں طرف سے شش رنگا بنا دیا ہے جو ہم کو محو حیرت بنائے ہوئے ہے۔ یہ حالت دیکھ کر مغربی علوم ہم پر ہنس رہے ہیں کہ ہم کیسے عجائب المخلوقات ہیں۔ جو اس نادیدہ طور سے اس شیش محل کو دیکھ رہے ہیں۔ اور مشرقی علوم ہم پر رو رہے ہیں کہ ہم سینکڑوں برس تمہاری ترقیوں کا ذریعہ ثابت ہوئے مگر تم نے ہم کو ایسا پست کیا کہ اب ہم کو قد آدم بلند ہونا مشکل ہو رہا ہے۔

نیو فیشن کی تمام سوسائٹی میں ایشیائی شاعری کو قابل قدر سمجھنے والا شاذ کوئی ہو۔ لیکن بے دیکھے اسکو بُرا کہنے والے اور بے سمجھے اس کو ناپسند کرنے والے بہت ہیں۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کس زبان میں شاعری کی ایجاد کب ہوئی اور کیوں ہوئی اور ایشیائی شاعری کا موضوع کیا ہے اور کس زبان کی شاعری نے کہاں تک اپنے ملکی یا قومی مذاق کی تمام دلچسپیوں کا نمونہ پیش کیا ہے۔

ایشیائی شاعری کے سبجکٹ پر مکمل بحث کرنا برسوں کی دیدہ ریزی کا کام ہے۔ اور اس فن کے متعلق ایک کتب خانہ سامنے ہونا چاہیے۔ مجھکو دوسرے اشغال و مشاغل سے اس کام کی بہت تھوڑی فرصت ہے اور کتب خانہ کیسا

معمولی کتابیں بھی میرے سامنے نہیں تاہم جو لکھا گیا ہے وہ عام خیالی کو اکثر
مقاصد سے مطلع ہونے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

شعر کیا ہے

من کیستم آن سالک کونین مسیرم — کز پختہ جوہر قدس است خمیرم
آنجا کہ ادب نغمہ طراز است سمیعم — وانجا کہ ہنر جلوہ فروش است بصیرم
در خانۂ مجنوں کہ خراب است غبارم — در حجلۂ لیلےٰ کہ بہشت است عبیرم

آن حسن مجسم کہ زلب تشنگیٔ وحی
جبریل در آید بحرم گاہ ضمیرم

عربی میں شعر بال کو کہتے ہیں۔ یہ بالوں سے شکل انسانی کی بہت بڑی زینت
ہے اگر عورت مرد بال منڈا ڈالیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں لیکن نیچرل
خوبصورتی کی باتوں سے وہ زینت ہے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ روئے زیبا
کے لئے زلف گیسو کا ہونا ضرور ہے۔ جناب شیخ کا حسن محاسن سے ہے
اور بال خود ہی سرمایۂ زینت نہیں بلکہ حسن صورت کے لئے بھی ذریعۂ ناز
ہیں اسی طرح شاعری کے نہ ہونے سے لٹریچر کا نقصان نہیں لیکن جو ذاتی
خوبصورتی اس کو حاصل ہے اور اس کے سبب سے دوسرے اعضاء و اجزا
کو رعنائی کا حصہ پہونچتا اور ان کو حسین بناتا ہے وہ حاصل نہیں ہو سکتا ہے
یہ مثال اچھی شاعری کے لئے ہے اور گندہ شاعری کی مثال ان بالوں سے
دیجا سکتی ہے جو گرد و غبار سے دیکھے جاتے ہیں اور وہ رکھنے کے قابل نہیں
اب غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ زلف جاناں کے بغیر چہرہ کی زینت نہیں
اور آپ کسی سر منڈے معشوق کو دیکھنا پسند نہ کریں گے اگرچہ وہ کیسا ہی حسین
ہو۔ یہی مفہوم شعر کا ہے۔ ادب بجائے خود ایک حسن کا پتلا ہے اور شاعری
اس کے روئے زیبا کے لئے زلف جاناں کی طرح بجائے خود حسن اور

اُس حسن کو زینت دینے والی ہے۔ اور مفہوم کلام میں شعر ایک سانچہ ہے جس
میں خیال کی مختلف چیزیں مناسب وزن و مقدار سے ڈھلتی ہیں۔ اور شاعری
وہ صنعت خاص ہے جو اُن چیزوں کے ڈھالنے کو ایجاد کی گئی اور شاعر اُن چیزوں
کا ڈھالنے والا ہے۔ شاعری انشا۔ اور ادب کے دیوانخانۂ عام کو بطور فرنیچر کے
ہے۔ اور جیسا کہ ہر مکان کے لئے فرنیچر کا ہونا خوش آیند اور اُس مکان کی
زینت کا سبب ہے ویسے ہی دیوانخانۂ ادب کے لئے شاعری کا فرنیچر خوش آیند
اور اُس مکان کو زینت دینے والا ہے۔ اور اصطلاح سخن میں دو مصرعے موزوں کو شعر کہتے
ہیں اور اس کی مثال ابرو سے ایسے دکھائی ہے کہ معشوق کے چہرہ پر بھویں بطور دو مصرع یا ایک شعر کے ہیں۔

شاعری کی ابتدا

عالم قدس کے اُس پار ہے خلوت میری — ڈھونڈنے والے وہاں پائینگے صورت میری
پوچھتے ہیں دم آخر وہ حقیقت میری — ہو دے طاقت گفتار کہ کچھ کہنا ہے

اس بات کا ٹھیک ٹھیک اور واقعی فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس
زبان کو نظم کلام کی عزت حاصل ہوئی۔ کیونکہ ایشیا اور ایشیا کے ساتھ جن جن ملک
کو دلچسپی اور وابستگی رہی اُن میں ہر زبان کے ترقی افزا سامانوں میں ادب کے
ساتھ نظم کا پتہ ملتا ہے۔

سنسکرت

جو ہزاروں برس پہلے سرتاج عالم تھی اور اب بھی اُس کو اُم الالسنہ ہونے
کا فخر حاصل ہے۔ اُس میں نہایت اعلےٰ درجہ کی شاعری کے ذخیرے دفتر مرتب
اور مدوّن ہو چکے ہیں۔ عرفان حقیقی کا نہایت عالیشان کام اور فلسفہ اور
حکمت کا اشراقی اور الہامی حصہ شاعری کو سپرد تھا۔ اور مذہبی خدمتیں اور
بادشاہی دربار کے بہتیرے کام شاعری سے متعلق تھے چنانچہ اب بھی جتنے

اشلوکوں سے اُن کا پتہ ملتا ہے۔ مجھ سے آٹھارہویں صدی کے مشہور
[illegible] سرستی نے بیان کیا کہ سنسکرت بجائے خود ایسی زبان ہے جو دیوتاؤں
کی زبان سمجھی جاتی ہے کی منزل اعلیٰ خیال کی جا سکتی ہے اور اس کے اصول نے اسکو
نہایت [illegible] سے رکھا۔ اس پر سنسکرت کی شاعری نے وہ مرتبہ حاصل
[illegible] آپ ہی اپنا نظیر کہا جا سکتا ہے۔ جیسے آفتاب اور آفتاب کی روشنی پھول
اور پھول کی خوشبو سنسکرت کی شاعری کا حسن اور اسکی بجایت کسی زبان
[illegible] نہیں۔ یہ کہنا انہوں نے کہا کہ اب کوئی سنسکرت کا ہمہ دان نہیں ہے
[illegible] اسکے اشعار کی خوبیاں حقیقتہً سمجھی جا سکتی ہیں اُن کی کیفیت کو وہی
شخص جان سکتا ہے جو اس کا ماہر ہو۔ اور اس کے بہت سے لطائف دوسری
زبانوں میں ترجمہ کرنے سے ادا نہیں ہو سکتے اور نہ وہ لفظی ترجمہ میں سما سکتے ہیں
پھر انہوں نے ایک نقشہ دکھایا جسکے خانوں میں کہیں ایک ایک حرف کہیں
ایک ایک لفظ کہیں اس کے نیچے پر پھیلے ہوئے تھے اور مجھ سے کہا کہ سنسکرت
کی شاعری میں ایک صنعت تھی جس کا ترجمہ گورکھ دھندا کیا جا سکتا ہے اور جیسے
[illegible] کو بالکل تجزے علیحدہ کردیں اور اُن کا جاننے والا اُن کو ملا دے یعنی
[illegible] صنعت و الفاظ کے معانی کا جمع کرنا ہر پنڈت کا کام نہ ہو سکتا تھا اس
صنعت میں ایک مطلب تو وہ ہوتا تھا جو لکھنے والے کا حقیقی مقصد ہے دوسرے
[illegible] ایسے پیدا ہوتے تھے جو دوسرے مطالب واسطہ رکھتے ہیں
یہ ایک ایسی چھپی ہوئی صنعت تھی جسکے در پردہ میں اصل مطلب کا کھلنا اگر محال
نہیں تو بہت مشکل ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نقشہ میں کامروپ کے راجہ نے راجہ دکن
[illegible] کا سوال کیا ہے اور در پردہ اپنے کمال علمی کو دکھایا ہے اور اصل
[illegible] بات کو دوسروں کی آگاہی سے بچایا ہے۔ راجہ کا نام سورج سین اور
[illegible] کا نام گنگا پتی تھا۔ اس لئے اسکے ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ سورج کو
[illegible] نہانے کی اجازت ہو۔ سرستی جی کہتے تھے کہ اس نقشے کو مختلف طور

سے پڑھنے اور مختلف معنی کہنے سے ان چودہ شہروں (اٹھ چودہ سو پچاس) ...
اور رموز لفظی و معنوی کا انحصار کیا گیا ہے - ہر چند اس زمانہ کے مذاق ...
یہ صنعت ایک طرح کا آفت جان معلوم ہوتی ہو بلکہ اُس کے ذکر سے ہمارے
دل میں ایک خاص الجھن کا احساس معلوم ہوتا ہوا پایا جائے لیکن اُس سے
زبان سنسکرت کی نہایت اور پچھلے مذاق کے وقیق ادب کا پتہ ملتا ہے
مسلمانوں میں شہنشاہ جلال الدین اکبر کے وزیر و ندیم علامہ ابوالفیض فیضی
کو سنسکرت میں خاص قابلیت حاصل تھی۔

بھاشا

سنسکرت کے بعد بھاشا نے ہندوستان میں دخل کیا۔ بعض لوگ بھاشا
کو سنسکرت کی لڑکی خیال کرینگے۔ لیکن اس لڑکی میں ماں کے اوصاف ...
وہ درباری تھی تو یہ بازاری ہے۔ بھاشا میں نظم اور شاعری کا ایسا رواج ہوا کہ
کوئی علم اور کوئی فن ایسا باقی نہ رہا ہوگا جس کو نظم میں نہ لایا گیا ہو۔ بھاشا نے نظم
کو ہر بات کی دلنشینی کا ذریعہ سمجھا۔ الہیات۔ ریاضیات۔ بیدک۔ کیمسٹری۔ ...
عشق و حسن وغیرہ وغیرہ سب کو نظم کا لباس پہنایا اور اُن کو آسانی سے جلد
یاد ہونے کے لئے مختصر اور دلچسپ بنایا گیا۔ بچے سے لے کر جوان اور جوان
سے لیکر بڈھے تک ہر طبیعت اور ہر درجہ کے حسب حال اُس کو وسعت دی
گئی اور ہر ایک کے مذاق کا لحاظ رکھا گیا۔ اور نظم کو ہر درجہ اور مذاق کے مصرف میں ...
کیا گیا۔ چنانچہ اب بھی اُس کا پتہ سینکڑوں کتابوں سے ملسکتا ہے۔ ...
میں ایسے ایسے کھیل داخل کئے گئے جن سے اذہان میں تیزی اور ...
کی طاقت کو ترقی ہو اور باتوں باتوں میں بڑے بڑے استعارات معنوی ...
سمجھنے کی عادت پڑے جس کا پتہ اب بھی بھاشا کے اکثر دوہروں ...
انمل کہہ کرنیوں سے ملتا ہے۔ بھاشا میں یہ علمی کھیل بڑی ...

مسلمانوں نے بھی بھاشا کی تصنیف و ترجمہ اور شاعری سے دلچسپی حاصل کی
اور قابل قدر حصہ پایا ہے۔ ملک محمد جائسی کا نام پدماوت کی تصنیف سے
خاص و عام کی زبان پر ہے۔ بلگرام میں اکثر بزرگ ایسے گذرے جو بھاشا کو اچھی
طرح جانتے تھے۔ اور اب بھی بہتیرے مسلمانوں کو بھاشا کے ساتھ خاص
دلچسپی ہے۔ پہلے زمانہ میں برج کی بھاشا کو خاص قسم کی عزت کا فخر حاصل تھا
جیسے شیراز و اصفہان کی فارسی اور دلّی اور لکھنؤ کی اردو لیکن اس زمانہ میں
بھاشا اُس باریک بینی سے آزاد ہوگئی ہے۔ تاہم جن مقامات میں بھاشا کا چرچا
زیادہ ہے یا جس سوسائٹی میں اُسپر خاص توجہ کیجاتی ہے اُس کو عام مذاق
میں زیادہ پسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے مگر اب بھاشا میں بھی ایک نیا تغیر
ہوا ہے۔ اور عربی فارسی اردو انگریزی اور ہندوستان کے دوسرے حصص
کی زبانوں نے اُس میں داخل ہوکر اُس کو ایک نئی بھاشا بنا لیا ہے جو سو دو سو
برس پہلے کی بھاشا سے دوسری قسم کا ہے اور ہندو طبائع کو جو مذہبی مقامات
کے رہنے والے یا اپنی پرانی زبان سے لگاؤ رکھنے والے ہیں۔ بھاشا کی اصلاح
و ترقی کے متعلق ایک جدید خیال پیدا ہوا ہے۔ جس سے ہندو طبائع کو لگاؤ ہونا
کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ مگر وہ اس سبق کو بہت دور چھوڑ آئے ہیں اور
اب وہاں تک پہنچنا آسان بات نہیں۔

عربی

عربی عرب کی زبان ہے جسکو افریقہ کے ساتھ خاص تعلق ہے لیکن اسمیں
کچھ شک نہیں کہ عرب سے زیادہ عجم نے عربی کو ترقی دینے اور مختلف زبانوں
کے علوم کو عربی میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ عربی پر ایشیا کا خاص
حق ہے جس کا پتہ مختلف تصنیفات سے ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام
سے پہلے ایام جاہلیت عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا جو کچھ پڑھتے تھے

وہ زبانی پڑھتے تھے۔ اسی طرح سینکڑوں ہزاروں اشعار زبانی یاد رکھتے تھے
اور قبائل عرب کی خلقی فصاحت و بلاغت اپنی رہائش و جائے پیدائش کے
حسب حال شاعر بنا لیا کرتی تھی۔ دنیا میں عرب کے سامنے کوئی قوم خلقی شاعر
ہونے کا دعوے نہیں کر سکتی اب بھی جو خالص عرب ہیں اُن کا بچہ بچہ مذاق
شاعری کو فطرتاً اپنے ساتھ لایا ہوا پایا جاتا ہے اور یہ بات ایسی واضح ہو چکی
ہے کہ اس پر بعض بڑے بڑے نامی پروفیسروں اور یورپ کے نامور محققوں
نے شاعری کے مذاق کو حسب استعداد قابلیت داخل فطرت تسلیم کرنے کے
لئے قبائل عرب کو دلیل میں پیش کیا ہے اور عربی میں شاعری کا جو رتبہ ہے
وہ ظاہر ہے۔ عربی زبان میں کوئی ادیب ہی نہیں کہا جا سکتا جب تک اقسام
شاعری کا ماہر کامل نہ ہو۔ ہر قسم بلاغت کے لئے شاعری کا جاننا لوازمات ادب
میں سے ہے۔ شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی سابق پروفیسر مدرسۃ العلوم
علی گڈھ اسلامی کتب خانوں کی تحقیق کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ عرب میں شعر و
شاعری اور انساب کا چرچا اگرچہ نہایت قدیم زمانہ سے تھا لیکن تحریر کا مطلق رواج
نہ تھا سب سے پہلے جس نے اس فن کی بنیاد ڈالی وہ قبیلہ طے کے تین شخص تھے
مرامر۔ اسلم۔ عامر ان لوگوں نے ایک جا جمع ہو کر حرفوں کی شکل اور وضع قرار
دی اور حروف ہجا اس ترتیب سے مقرر کئے جیسے سریانی زبان میں تھے۔ ان
لوگوں سے حیرت والوں نے سیکھا حیرۃ والوں کا ایک شاگرد جس کا نام بشیر بن
ولید تھا اور دومۃ الجندل کا رئیس تھا کسی کام سے مکہ گیا وہاں ابو سفیان امیر معاویہ
کے باپ سے ملاقات ہوئی۔ ابو سفیان نے اُس سے اس فن کے سیکھنے کی
درخواست کی۔ چنانچہ ابو سفیان اور ابو قیس بن عبد مناف دو شخص اُس کے
شاگرد ہوئے اور چونکہ یہ دونوں تجارت کے ذریعہ سے طائف آیا جایا کرتے تھے
اس لئے طائف میں بھی تحریر کا رواج ہو گیا۔ بشیر نے مصر اور شام میں بھی
بہت لوگوں کو شاگرد کیا اور رفتہ رفتہ اکثر قبائل میں تحریر کا رواج ہو گیا یہاں تک کہ

جب اسلام کا ظہور ہوا تو صرف ایک قبیلۂ قریش میں سترہ شخص صاحب قلم موجود تھے جن میں یہ حضرات بھی تھے۔ عمر بن خطابؓ۔ عثمان بن عفانؓ ابو عبیدہؓ بن الجراحؓ۔ بجز عورتوں میں بھی اس فن کا رواج ہو چلا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں شفاء بنت عبداللہ اور حضرت حفصہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں مدینہ منورہ میں بھی آ اسلام سے پہلے تحریر کا رواج تھا جس کے موجد یہود تھے یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری کے خاتمہ میں مذکور ہے۔ مولانا شبلی کی اس تحقیقات پر رسالۂ اصلاح عظیم آباد میں ایک عالمانہ اور محققانہ ریویو کیا گیا ہے جس میں اس سے پہلے فن کتابت کے موجود ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن ہم کو یہاں اس بحث میں پڑنے سے کوئی سروکار نہیں۔

ہندوستان میں بھی عربی کے بڑے بڑے ادیب پیدا ہو چکے ہیں جو تمام دنیا میں لاثانی تسلیم کئے گئے ہیں۔ یا ان کی شاعری اور ادب میں کوئی ایسی نرالی بات پیدا ہوئی ہے جو دوسری جگہ نظر نہیں آتی جیسے ابوالفیض فیضی جسنے قرآن کی تفسیر سواطع الالہام بے نقط لکھ کر دنیا کو دنگ کر دیا۔ یا میر غلام علی آزاد بلگرامی جن کا دیوان سبحۃ المرجان عربی کی زمین پر فارسی اور بھاشا کی گلکاریوں سے ایک نرالی چیز بن گیا ہے جس کو تمام عرب بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور وہ حلاوت کسی عرب کے دیوان میں نہیں پائی جاتی یا سید محمد مرتضےٰ زبیدی جو قصبہ مردم خیز بلگرام کا فخر۔

اور جو تاج العروس شرح قاموس کے مصنف ہیں۔ ان کی نسبت اخبار ہلال مصری لکھتا ہے کہ یہ ہندی فاضل جس کی تصنیف کا چرچا تمام عرب روم شام بلکہ تمام جہان میں ہو رہا ہے اس کا ہم پلہ کوئی فاضل آج روئے زمین پر نہیں ملتا۔ سید سید مرتضےٰ اسنہ ۱۱۶۴ ہجری میں ہندوستان سے بعزم حج روانہ ہوئے۔ پھر موضع زبیدہ علاقہ یمن میں سکونت اختیار کی اور وہیں شادی ہوئی۔ علامہ موصوف کے سینکڑوں شاگرد مصر اسکندریہ و استنبول اور نواح یمن میں پائے جاتے ہیں اور

خود سلطان عبدالحمید خان اول نے سنہ ۱۱۹۳ ہجری میں اس حدیث کی سند روایت
حاصل کی اور ڈیڑھ سو قرش ہدیہ دیے۔ آپ کو اس وقت سلطانی سے معزز ہو گئے تھے آپ
کی تصنیفات سے مشہور کتابیں تاج العروس کے علاوہ ہیں۔ ان کتابوں میں سے حضرت
امام غزالی کی احیاء العلوم کی شرح نہایت عجیب اور لاثانی ہے جو نہایت ضخیم دس ہزار صفحہ
سے زیادہ صفحوں میں دس جلدوں کے اندر چھپی ہے۔ سنہ ۱۲۰۵ ہجری میں آپ نے بمقام
مصر مرض طاعون میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عربی ہندوستان میں بجھتا ہوا چراغ ہے اور یہ اسلامی روز بروز کم ہوتا جاتا ہے
لیکن لوگوں کو خدا نے عقل سلیم عطا فرمائی ہے وہ اس امر کا اندازہ کر لیں کہ ہمارے
تعلقات ممالک عرب اور عربی زبان سے کیسے قریب ہوتے جاتے ہیں اس لئے
ہم کو اس چراغ میں تیل ڈالکر چراغ افروزی کا خیال رکھنا ضرور ہے ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے
گھر کا چراغ بجھا کر روشنی سے اندھیرے میں پڑ جائیں۔

یورپ پر عربی کا حق

محققین یورپ نے خود اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ ابتدا میں یورپ نے تمام
علوم عرب سے حاصل کئے پھر ان کو جلا دی اور ترقی دی۔ آج تک فیض پہنچ رہے ہیں سب علوم میں
دو سو برس پشت کی سات صلیبی جنگوں کے زمانہ میں جب یورپ کے شاہزادے
یورپ مسلمان بادشاہوں اور امیروں سے ملاقی ہوتے تو اس وقت یورپین امرا
کو اہل عرب کے ادبا و شعرا و محققین اطبا و حکما کے دیکھنے کا موقع ملا۔ نتیجہ اہل
فرانس کی پہلی تاریخ لوئیس نہم کے عہد میں جو سنہ ۱۲۷۰ء میں فوت ہوا فرنچ مذاق
اور عربی ترتیب پر لکھی گئی۔ پھر بادشاہ لوئیس یازدہم کے عہد میں جو سنہ ۱۴۸۳ء
میں فوت ہوا۔ شہر ارات بیلی میں ایک علمی مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی اور اندلس سے عربی
تعلیم یافتہ استاد بلائے گئے۔ سنہ ۱۳۲۳ء میں شہر طولوز کی سرگرم انجمن کے ممبروں
نے ایک علمی کالج کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کالج کے طالب علموں کے لئے وظیفے

مقرر کئے اور امتحان میں عمدہ لیاقت ظاہر کرنے والے طلبہ کو انعامات تقسیم کرنے
کا ایک عجیب اصول اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ سونے چاندی کے پھول بنائے جاتے
تھے اعلےٰ درجہ کا طلائی پھول فی البدیہہ عربی شعر کہنے والے طالب علموں کو دیا
جاتا تھا یا اُن ہونہار طالب علموں کو جو عربی کی طرز پر فرنچ زبان میں اشعار تصنیف
کر سکیں۔ اور قوم کے حوصلہ بڑھانے والے لوگ کالج کے دروازہ پر سونے
چاندی کے پھولوں کے گلدستے لٹکاتے تھے تاکہ امتحان میں جو طالب علم جس درجہ
میں پاس ہو اُس کو اُسی درجہ کا گلدستہ دیا جائے۔ نکتہ رس طالب علم جن کی طبیعتوں
میں شعر کا مادہ ہوتا تھا۔ امتحان کے کمرہ میں بیٹھ کر عجیب عجیب طویل قصائد بنا لیتے
تھے اور انجمن میں منظور ہونے کے بعد وہ گلدستے حسب لیاقت اُن کو دئے جاتے
تھے دو صدیوں تک یہ کالج اسی طرز پر چلتا رہا اور اندلس کے مسلمانوں کے
فیوض و برکات نے ان میں شاعری اور ادب کی ایسی روح پھونکی کہ فرنچ عورتیں
بھی اس علمی مشغلہ میں حصہ لینے لگیں چنانچہ پندرہویں صدی کے آخر میں طولوز
کی ایک دولتمند عورت نے کئی لاکھ پونڈ اس کالج کو یونیورسٹی بنانے اور انعامات
کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے عنایت کئے اسی روز سے اس علمی یونیورسٹی
کی ثروت و فراخدستی بڑھ گئی اور دور دور کے شعراء کی رغبت ان گرانبہا انعامات
کے حاصل کرنے کی جانب زیادہ ہوئی۔ اہل فرانس نے خالص فرنچ زبان کو عربی
طرز پر لا کر قصائد تیار کرانے کے لئے اعلان دئے اسوقت کے شعراء نے فرنچ زبان
میں عربی مضامین کو ڈھالنا شروع کیا اور فرنچ زبان جو پہلے چنداں دلچسپ نہ تھی عربی
مضامین کے جواہر زر نگار سے مزین ہو کر ایسی دلکش اور دلچسپ ہو گئی کہ آج تک
یورپ کی دوسری زبانوں سے باعتبار ادب کے معتبر اور باعزت مانی جاتی ہے
اور یہ انجمن اُس وقت سے اب تک چلی آتی ہے اس وقت اُس کا نام پھولوں کی اکیڈمی
کر کے مشہور ہے اس انجمن میں چالیس ممبر ہوتے ہیں اور یہ اکیڈمی اپنے فرائض مقررہ
کی رو سے قواعد زبان فرنچ اور فنون ادب کی محافظ سمجھی جاتی ہے۔ ہر ایک سال

کے اختتام پر اس انجمن کا جلسہ تقسیم انعامات ہوا کرتا ہے۔ جس میں مستحقین کو انعامات
تقسیم ہوتے ہیں اس انجمن نے نو قسم کے پھول انعامات کے لئے مقرر کئے ہیں جو سونے
چاندی کے بنائے جاتے ہیں اور بعض کو مرصع کیا جاتا ہے۔ شعر و قصائد کے انعامات
کا انتظام علیحدہ طرز پر ہے اور نثر و خطب کے انعامات کا اہتمام علیحدہ ڈھنگ پہ۔
اخبار الھلال مصری نے ایک آرٹیکل میں بیان کیا ہے کہ فرنچ لوگوں نے عرب
سے علم قوافی۔ عروض۔ غزل۔ آداب النظم والنثر و قصائد کو حاصل کیا۔ قصص و
حکایات ضرب الامثال اور نحو اور علم اخلاق اور علمی کورسوں کی تدوین کے طریقے
سب عرب سے سیکھے یہ سب کچھ کتاب تواریخ الادب الفرنساوی میں
مفصل مذکور ہے۔

پارسی

سرزمین ایران جو ہزاروں برس کیانی۔ ساسانی۔ پیشدادی۔ شاہنشاہوں
کی تخت گاہ رہی وہاں دور اوّل کی زبان مطلق فارسی تھی۔ جسمیں دوسری زبان
کی شرکت نہ تھی۔ پارسیوں کے صحف قدیم استا و ژند۔ پاژند۔ دساتیر اس
زبان کا یادگار ہیں۔ اب اس زبان کی کتابیں بہت نایاب ہیں۔ ڈھونڈھے
سے بھی نہیں ملتیں۔ آکسفورڈ لنڈن کے عالیشان کتب خانہ میں بعض پارینہ
نسخوں کا پتہ ملتا ہے۔ پھر دوسرے دور کی زبان پہلوی کہی گئی۔ اور اس نے
بھی اپنے آپ کو دوسری زبان کے میل سے ایک اعلےٰ حد تک پاک و صاف رکھا
لیکن دور اول کی زبان کے مقابلہ میں یہ دوسری چیز بن گئی اور ایک دوسرا مذاق اس میں
شریک ہو گیا۔ اور طرز ادا کا بھی رنگ بدلا۔ اس عہد کی زبان کا بہتر سے بہتر
نمونہ شاہنامہ ہے۔ فارسی میں شاہنامہ ایسی کتاب ہے جس کو ادبائے عرب نے
قرآن العجم کے نام سے یاد کیا ہے اور اسکو شاعری کا بے مثل نمونہ ہونے کی عزت
حاصل ہے۔ اس کے بعد زبان کا تیسرا دور شروع ہوا۔ جو سعدی اور حافظ سے

شروع ہوتا ہے جو پانسو برس تک ادب آموز دنیا رہا۔ پھر فتح علی شاہ بادشاہ اور فتح علی خاں صبا ملک الشعراء ایران کے زمانہ سے ایران کی پارسی میں تبدیلیات کی آمد ہونے لگی۔ اور انگریزی روسی عربی ترکی وغیرہ زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کی شرکت اور آمیزش سے موجودہ فارسی ایک طرفہ معجون نظر آنے لگی جو پہلی کے خلاف ہو گئی۔ اور اس دور آخر کا بہترین نمونہ حکیم قاآنی کے کلیات اور ناصر الدین شاہ کجکلاہ ایران کے دو مجلد سفر ناموں سے دریافت کیا جا سکتا ہے اور فارسی میں جو نمایاں کلام شاعری نے کیا وہ اس کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

اور ہمارے علم عروض کی بعض کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ فارسی میں بہرام نے پہلا شعر کہا اور وہ یہ ہے

منم آں شیر دماں و منم آں شیر یلہ
نام بہرام مرا و پدرت بوجبلہ

بعض کہتے ہیں کہ رودکی سمرقندی پہلا شاعر ہوا۔ اور یہ دونوں روایتیں قریب قریب سب کتابوں میں نظر پڑتی ہیں اور ایک دوسرے سے نقل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ورتی اور پہلوی کا محقق کبھی اس قول کو باور نہ کرے گا کہ بہرام سے پہلے فارس میں شاعری نہ تھی۔ بہرام تیسری صدی عیسوی کے اخیر میں تھا اور رودکی عروج اسلام کے زمانہ کا شاعر ہے شاید یہ ہو کہ بہرام فارسی نہاد اور عرب نژاد ہے۔ اور اسی لئے اس کے اس شعر سے بھی کیفیت کا پتہ ملتا ہے اس نے پہلے پہل یہ شعر کہا ہو اور اسکو پہلا شعر سمجھا گیا ہو۔ اور اسی طرح مسلمانوں میں سب سے پہلے رودکی کو شاعری کا تمغہ حاصل ہوا ہو نہ یہ کہ بہرام اور رودکی سے پہلے شاعری کا وجود ہی نہ تھا۔ دراں حالیکہ لغت قدیم میں غزل اور قصیدہ کی جگہ چامہ اور چگامہ کے الفاظ موجود ہیں۔ فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لئے گئے اور شاعری نے بادشاہوں کی [illegible] اور جلوت اور رزم و بزم سے خاص تعلق رہا اور شاعروں کی [illegible] ہوتے

کی گئی جس پر وزراء کو رشک آ رہا ہے۔ شاعر کو ملک الشعراء کا خطاب نہ صرف دربار میں بار پانے بلکہ بادشاہ کے قریب بیٹھنے کا مستحق بنا دیتا تھا۔ اور سمجھا جاتا تھا کہ جیسے بادشاہ اپنے ملک کا بادشاہ ہے ویسے ہی یہ اپنی قلمرو کا بادشاہ ہے اس لئے دو بادشاہوں کے پاس بیٹھنے میں مضائقہ نہ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں شاہ عالم بادشاہ نے مہاراجہ سندھیا کو فرزند خاص کا خطاب اس لئے عنایت فرمایا تھا کہ یہ خطاب اُن کو بیٹھنے کا مستحق بنا دے۔ قصہ مختصر شاہ محمود کے زمانہ میں فارسی نے ہندوستان پر خاص اثر ڈالا اور ایران اور غزنی سے نکل کر دلی لاہور کشمیر اور دکن سے چلتے چلتے سارے ہندوستان میں کم و بیش اپنا دخل اور رسوخ پیدا کر لیا۔ اور ہندوستان میں ہندوؤں کے ہزاروں خاندان فارسی لکھنے پڑھنے میں ممتاز نظر آنے لگے۔ بلکہ بہتیرے ہندوؤں نے خود کو فارسی میں صاحب تصنیف اور مستند ثابت کیا اور فارسی کی شاعری بتدریج تعلیم یافتہ پارٹی کا ایک مذاق خاص ہو گئی۔

اس دور کے قابل قدر زمانہ میں جبکہ شیراز کو سعدی اور حافظ جیسے سخن طرازوں سے بلند نامی حاصل تھی دلی کو امیر خسرو دہلوی کی سخن آرائی نے دوسرا شیراز بنا رکھا تھا خسرو کے کمالات شاعری اور ادب پر ریویو کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔

میرے نزدیک اس رتبہ کا شخص نہ صرف دلی بلکہ تمام دنیا میں بھی دوسرا نظر نہیں آتا جسکی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلا واسطہ مبدء فیاض سے مضمون پا رہا اور بلا ذریعہ لوح محفوظ کو دیکھ رہا اور اس کی نقل اوتار رہا ہے جو اس کا اور صرف اس کا حصہ ہے جس کو خسرو کے معیار کمال کے دیکھنے اور میرے بیان کے تصدیق کی خواہش ہو وہ مطبع اردو اخبار سے اعجاز خسروی منگا کر دیکھے اور اس سے خسرو کے لاثانی فضل و کمال کا اندازہ کرے۔ اور نیز اس امر کا اندازہ کرے کہ اسوقت جسکی سوسائیٹی میں کس قسم کے عالمانہ اور فاضلانہ مذاق سے دلچسپی حاصل کی جاتی تھی۔ اور ادب کے پہلوان کس کس ترکیب سے دماغ کے روشن کرنے اور خیال کی بلند پروازی کے لئے

گیاکیا درزشیں کیا کرتے تھے۔ بہر حال ہندوستان میں پانسو برس تک فارسی لٹریچر اور فارسی شاعری کا چرچا رہا۔ اب بھی ہر حصہ ملک کو اُس سے کچھ نہ کچھ لگاؤ اور دلچسپی باقی ہے اگرچہ اُس کو یونیورسٹی سے نکل جانے میں غیر متوقع نقصان پہونچا ہے۔ حالانکہ ہمارے تعلقات اُن ملکوں اور قوموں سے جہاں فارسی بولی جاتی ہے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم کو فارسی کا بھلا دینا ایک ایسا عجیب سبق ہے جو ہم کو یاد رکھنا چاہیے۔

کلکتہ میں جو عالیشان جلسہ محاڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کا ہوا تھا۔ اُس میں مولانا شبلی صاحب نعمانی نے نہایت محققانہ اور فاضلانہ طور سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ فارسی میں ہر قسم کے علوم کا ذخیرہ فراہم ہوچکا ہے اور ہماری قومی لیاقتوں کو فارسی کے ساتھ ایسی وابستگی ہے جو اُس سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی اور فارسی کے نہ جاننے سے ہمارا ادب بالکل خراب ہوجا سکتا ہے۔

فارسی شاعری اور یورپ

شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی کے نواسے اور ہمارے لائق دوست مولوی شرف الحق صاحب مددگار بندوبست حیدرآباد کے بیٹے مشرف الحق صاحب حصلہ اللہ مرامہ شہر اڈنبرا اسکاٹلینڈ سے لکھتے ہیں کہ یورپ میں اس وقت دو لاکھ سے زیادہ مشرقی قدیم کتابیں مختلف کتب خانوں میں نہایت احتیاط اور آراستگی سے رکھی ہیں۔ سب سے نایاب مجموعہ پیرس میں ہے جہاں اسلامی کتب خانہ اسپین اور افریقہ کے بھی نایاب نسخے مل سکتے ہیں۔ فلارنس روم۔ ویانا سینٹ پیٹرز برگ میں زیادہ تر مشرقی مجموعہ فراہم ہے۔ میں اس وقت انگلستان کے مجموعوں کا مختصر حال لکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ہمارے تعلیمی مرکز علیگڈھ کو اپنا کتب خانہ مرتب کرنا ہو تو ایسے نسخوں کو مہیا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے یا کم سے کم ان

اردو دوسرے معنٰے سے امید کیجاتی ہے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ جو حصّہ جابجا پڑا پڑا یا باقی رہ گیا ہے وہ ایک جگہ فراہم ہوکر ہمارے کام آئے۔

اکسفورڈ کی لائبریری میں پروفیسر ساحاکی مرتب کی ہوئی فہرست کے موافق ۱۸۸۹ء تک فارسی کی قلمی دو ہزار اٹھتیس کتابیں داخل ہوئیں۔ یہ ان کے عالی دماغ مصنفوں ان کے زریں قلم کاتبوں ان کے مضامین کی بندیوں ان کے نقش و نگار کی باریکیوں ان کے کاغذ کی چکنائی جلدوں کی پائیداری اور دستکاری کی صفائی وغیرہ کے بیان سے قاصر ہوں۔ اس میں نظم کی مختصر تشریح یہ ہے۔ فردوسی اور مقلدین۔ شیخ سنائی۔ انوری۔ خاقانی۔ نظامی۔ فریدالدین عطار۔ جلال الدین رومی۔ سعدی امیر خسرو۔ حافظ۔ شاہی۔ جامی۔ ہاتفی۔ ہلالی۔ فیضی۔ کلیمی۔ صائب مختلف نظم گلدستے اور نظم و نثر کے خلاصے (۱۸۴) تصوف کی نظم و نثر (۶۱) مسجع نثر۔ توشیح نظم۔ رقعات۔ فرمانوں کا مجموعہ۔ منقبات انشاء۔ چیستان۔ خوش خط قطعے وغیرہ (۴۸) فارسی اور ہندوستانی باتصویر کتابیں (۱۲) زردشتی لٹریچر زبان زند پازند پہلوی۔ پارسی (۸۷) نظم کی مختلف کتابیں مختلف مذاق اور مختلف علوم اور فنون میں (۷۵)

اکسفورڈ کے بعد کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں تین ہزار سے زیادہ اورینٹل قلمی کتابیں سنہ ۱۸۹۶ء کی فہرست میں مندرج ہیں جس فہرست کو مسٹر برن نے بہت بڑی محنت سے طیار کیا ہے اور یہ مشرق کا لاثانی تحفہ ہے۔ یہ کتابیں ڈیوک آف بکنگھم اور سر ولیم میور اور دوسرے علم دوست اصحاب اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں اور ڈائرکٹروں کے ذریعہ سے پہونچی ہیں۔ ان میں بعض کتابیں اس اہتمام اور فیاضی سے لکھوائی گئی ہیں اور ان کے نقش و نگار میں اتنی دولت خرچ ہوئی ہوگی کہ اب اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا

لنڈن کے مشہور و معروف برٹش میوزیم میں مختلف اقسام کی ساٹھ ہزار قلمی کتابیں جمع ہوچکی ہیں جن میں دس ہزار طلائی ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ ایسا

نے اتنا بڑا مجموعہ دنیا کے اور کسی عجائب خانہ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے شہزادوں نے
اور سیاحوں کی لکھائیں ان پر پہنچی ہیں۔ یہ کتابیں جن کی تعریف بیان سے باہر ہے
شیشے کے طاقوں میں بند میزوں پر نہایت صفائی سے رکھی ہوئی ہیں۔ برٹش
میوزیم کے سوا اور نفیس قلمی کتابیں اس ملک کے خانگی کتب خانوں میں بیشمار
ہیں جو مشرقی ممالک اور ٹرکی مصر وغیرہ سے کوڑیوں کے مول لی گئی ہیں۔
ڈبلن کا عجائب خانہ میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن وہاں بھی مشرقی کتابیں ضرور
ہونگی خصوصاً مشرقی کی انڈیا آفس لنڈن میں مشرقی کتابیں بیشمار جمع ہیں۔ انڈیا آفس
میں کم سے کم تین ہزار سات سو انتالیس کتابیں سنسکرت زبان میں [illegible]
لٹریچر کے متعلق لکھی ہوئی جمع ہیں۔ انڈیا آفس کے عربی فارسی مجموعہ کی فہرست
میری نظر سے نہیں گذری مگر برٹش میوزیم میں فارسی کتابیں اتنی ہیں جن کی فہرست
مسٹر چارلس ریو نے ۱۸۷۹ء میں مرتب کر کے چار موٹی موٹی جلدوں میں چھپوائی
ہے۔ ان چاروں جلدوں کا علیگڈھ میں ہونا ضرور ہے۔ لنڈن میوزیم میں مسٹر ریو
صاحب نے ایک حصہ ان کتابوں کے ناموں کا دیا ہے جن پر خود مصنفوں کے دستخط
اور مہریں ثبت ہیں یا خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور دوسرا حصہ فارسی کی
ان کتابوں کا ہے جن کو طلائی نقاشی اور طرح طرح کی تزئین و افشاں نے ہر صفحہ کو
گلدستہ یا پھولا ہوا چمن زار بنا دیا ہے۔ اور وہ کتابیں مصنفین ذیل کی جانب
منسوب ہیں جن کے نام نامی سے ایشیا کی دنیا کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

ملا کاتبی۔ یحییٰ شبستاری۔ حیدر شیرازی۔ ناصر الدین حیدر شیرازی۔ سنائی
حمید اللہ قزوینی۔ ابوالقاسم فردوسی۔ شہاب الدین سہروردی۔ ملا جامی
عبدالرزاق سمرقندی۔ نصیر الدین طوسی۔ اسدی رازی۔ شمس الحسن امیر اسعدی
شیرازی۔ شاہی۔ شرف الدین علی یزدی۔ ضیاء برنی۔ کمال الدین ابو العطا
المتخلص خواجوے کرمانی۔ مرزا اسکندر۔ نظامی۔ انوری۔ سوزنی۔ تقی شریف الدین
شفروہ۔ فخر الدین عراقی۔ نصیر باجانی۔ کسائی۔ حمزہ کوچک۔ فتوحی۔ رشید الدین

تھی ایک وہ جس میں بتوں کی تعریف اور تمجید بیان کی جاتی تھی دوسرے وہ جس میں
ترانۂ توحید اور پند و نصائح اور شجاعت و سخاوت وغیرہ کے ذکر ہوتے تھے
پہلی قسم کی شاعری کو اسلام نے منع کیا اور دوسری کو جائز رکھا۔ چنانچہ خود حضرت
علی نے شعر کہے اور اب آپ کا دیوان موجود ہے۔ اور خود آنحضرت صلعم
نے شعر سُنے اور شاعر کی تعظیم کو اپنی ردائے مبارک بچھائی ہے اور ایسے
شعروں کی تعریف فرمائی ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ قرآن میں شاعری
سے روکا گیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ خدا نے شاعری سے منع نہیں کیا۔ بلکہ
اپنے پیغمبر کی نسبت ارشاد فرمایا ہے کہ شاعری اُس کے لائق نہیں اور ایسا
ہونا بھی چاہیئے کیونکہ ایک ایسے جلیل القدر پیغمبر کے لئے جو بلا واسطہ لوح
محفوظ کا دیکھنے والا اور مبدء فیاض سے تعلق رکھنے والا ہے۔ شاعری کے
موضوعات اور تخیلات سزاوار نہیں ہو سکتے اور شاعری کا درجہ پیغمبری کے
درجہ کے ہمسر یا اُس سے برتر نہیں مانا جا سکتا اور جو شاعری قرآن میں ناپسند کی گئی وہ
اسی اول قسم کی شاعری ہے جس سے شرک جلی کا اعلان ہوتا ہے ورنہ دوسرے قسم کی
شاعری کے پسندیدہ ہونے میں شک نہیں ؎

بشنو از انصاف اگر مقبلی — شعر بود حجت روشن دلی
شعر کہ اصحاب نبی گفتہ اند — چوں در دریا توحت گہر سفتہ اند
شعر علی گفت و حسین و حسن — کعب و انس گفت و اویس قرن
شعر کہ حسان عرب گفتہ است — سینۂ کونین پذیرفتہ است

شعر کی تعریف میں حضرت امیر خسرو دہلوی کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں ؎

آنکہ نام شعر غالب می شود بر نام علم — حجت عقلی بتر گویم اگر فرمان بود
ہر کہ تکرارش کنی آدم بود استاد آں — آنچہ تعلیمے است استاد ایزد سبحان بود
پس چرا باید دانشی کند آدمی آموختن — تا بیاں غالب کہ تعلیمے ز یزدان بود
علم کز تکرار حاصل شد چو آبے در قمقمہ است — کز شے از دہ دلو بالا برکشی نقصان بود

بسکہ طبع شاعراں چشمہ ایست زاینیدہ گزاد
گر کشی صد دلو بیروں آب صد چنداں بود

ایک گت دے سے اور حضرت امیر خسرو سے بحث آپڑی بادشاہی دربار کا گویا اصول ادب سے واقف مختلف علوم کا ماہر کہنے لگا کہ موسیقی کو علم حکمت میں شمار کیا گیا ہے ۔ اور موسیقی دلوں پر خاص اثر ڈالنے کا ذریعہ ہے ۔ امیر خسرو نے کہا کہ یہ سچ ہے لیکن شعر خاص حکمت ہے اور موسیقی کو شعر کی ضرورت ہے مگر شعر کو موسیقی کی ضرورت نہیں ۔ اُسکے لطائف بلا واسطہ موسیقی دل پر اثر کرتے ہیں ۔ خلفائے بنی امیہ میں خالد ابن یزید بن معاویہ ادیب اور شاعر تھا ۔ اور اشعار عرب کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا ۔ پھر روز بروز اسکو ترقی ہوتی گئی اور خلفائے بنی العباس کا زمانہ تو ادب اور شاعری کا معدن پایا جاتا ہے ۔ پایۂ تکمیل اور تمدن اور قدردانی اور تفنن کے لئے یہ زمانہ ایسا عجیب زمانہ تھا جواب تک آپ ہی اپنا نظیر سمجھا جاتا ہے ۔ خلیفہ سُنّی وزیر شیعہ ۔ خلیفہ عربی الاصل ۔ وزیر عجمی النسل ۔ سارا دربار تمام مختلف مذاقوں سے ایسی عجیب معجون بن رہا تھا جو ہر دل کو فرحت اور ہر دماغ کو طاقت دینے والی ہو جسکو خلفائے عباسیہ میں سے ایک مامون رشید کا حال دیکھنا ہو اور وزرائے عباسیہ میں سے برامکہ کی لائف پڑھنا ہو وہ مولانا شبلی صاحب نعمانی سے المامون اور مولوی محمد عبد الرزاق صاحب کانپوری سے البرامکہ طلب کرکے جھونپڑے میں محلوں کا خواب دیکھے ۔

اسپین کا عالیشان کتب خانہ جو مستنصر نے تیار کیا اُسکے متعلق مولانا شبلی مشہور مورخ ابن خلدون اور ابن الابار کے حوالہ تصنیف سے لکھتے ہیں کہ صرف اشعار اور تذکرہ کے مجموعوں کی جو فہرست تیار کی گئی وہ آٹھ سو اسی صفحہ میں تھی ۔ اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ اشعار و قصائد کی کتنی کتابیں ہونگی جن کی فہرست آٹھ سو اسی صفحوں میں لکھی گئی ۔

آپ اس زمانہ کے نقشہ پر یوں غور فرمائیں کہ ایک جانب اسپین میں سلطنت اسلامیہ

کا گردوں بخروش نقارہ بج رہا ہے۔ دوسری جانب بغداد میں سلاطین عباسیہ کی عالیشان نوبت کی آواز سے تمام دنیا میں گونج رہی ہے۔ بخارا میں سامانی حکومت کا زور ہے۔ شام میں خاندان بنو حمدان سلطنت کر رہا ہے۔ شیراز کو آل بویہ کی حکمرانی کا فخر ہے مصر کو فاطمین مصر نے دوسرا بغداد بنا رکھا ہے عضد الدولہ کی سلطنت نہایت وسیع تھی اور اس زمانہ میں سب سے زیادہ ممالک اسی کے قبضۂ اختیار میں تھے وہ شاہی تمدن کے علاوہ بہت بڑا شاعر بھی تھا۔ اور علوم فنون میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے شیراز میں ایک عالیشان کتب خانہ قایم کیا تھا۔

سیف الدولہ تیغ اور قلم دونوں کا مالک تھا اور اسقدر علم دوست تھا کہ اُسکے دربار میں شعرائے باکمال کی گنتی خلفائے عباسیہ کے دربار سے کم نہ تھی حکیم ابو نصر فاریابی اسی کے دربار کا وظیفہ خوار تھا۔ جو علاوہ علوم حکمت کی شاعری کا بھی حکیم تھا۔

فاطمین مصر کو شاعری اور ادب سے جو شوق رہا اور انھوں نے جو لوگ اس فن کے جمع کئے اور جو سرمایہ بہم پہنچایا وہ اُن کا حصہ کہا جاتا ہے۔

محمد بن الحسین بغدادی نے ایک نہایت قابل قدر اور لاجواب کتب خانہ جمع کیا تھا۔ اس میں قدیم عرب کے اشعار و قصائد چمڑوں پر اور خراسانی اور مصری اور چینی کاغذ پر لکھے ہوئے بڑی احتیاط سے رکھے گئے تھے۔

بادشاہوں کے سوا تمام امیر اور وزیر ادب اور شاعری کا شیفتہ پایا جاتا ہے۔

اسلامی دنیا میں سیکڑوں حکیم اور علامہ شاعر پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے صوفیہ مرتاض شاعری کے شیفتہ نظر آتے ہیں۔ کوئی اعلے درجہ کا دربار تذکرہ شعرا سے خالی نظر نہیں آتا۔ اسی ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں نے شعر کہنے کا ... بھا شا۔ عربی۔ فارسی کی تصنیفات شاعری کی جو قدر کی وہ اس زمانہ میں ہم کو خواب

خیال معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ مسلمان بادشاہوں کی فیاضی اور قدردانی کا اندازہ
کرنا چاہیں تو میر غلام علی آزاد کی خزانہ عامرہ اٹھا کر دیکھیں جس میں صرف انہیں شاعروں
کا حال لکھا ہے جن کو صلہ کلام سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس میں کسی شاعر کا روپیہ اشرفی
سے تول دینا یا ہزاروں کی گنتی میں انعام پانا یہ تو ایک معمولی بات تھی۔ امیر خسرو
نے ایسا انعام بھی پایا ہے کہ وہ مع ہاتھی اور ہودج وعماری کے روپے سے تول
دئے گئے اس طرح پر کہ اُن کو مع ہاتھی کشتی پر سوار کرا کر جسقدر کشتی اُس بوجھ سے
پانی میں ڈوبی اُسی قدر روپیہ کشتی میں بھر کر اُن کو دیا گیا تھا۔ علی ہذا بعض شعراء کو
ایک ایک مطلع پر بائیس بائیس لاکھ روپیہ تک انعام کی نوبت پہونچ چکی ہے
اور سنسکرت اور بھاشا اور عربی نے جو صلات کلام اپنے اپنے زمانہ کے قدردانوں
سے حاصل کئے اُن کا ذکر افسانہ نظر آتا ہے۔ آج یورپ میں بادشاہوں کی
قدردانی کا یہ دستور نہیں لیکن کسی شاعر اور ناولسٹ کو پبلک اتنا دے نکلتی ہے
جسکو وہ بخوبی اپنی جگر کاوی کا معقول معاوضہ سمجھ لیتا ہے۔ اس کے مقابل ہندوستان
کا یہ حال ہے کہ نہ آج کل رئیسوں اور امیروں کو یہ توفیق ہے اور نہ پبلک کی
قدردانی سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے روز بروز ادب اور شاعری
کا بازار سرد ہوتا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو شاعر ہونا ایک قسم کی بے عزتی اور معیوبیت
اور حماقت میں داخل ہے۔

عربی شاعری کا ذخیرہ

آجکل مغربی دنیا نے ہر علم وفن کے لئے ایک خاص فلسفہ عقلی کو اُس کا
دیباچہ بنایا ہے۔ یہ علم یا فن کب ایجاد کیا۔ کس غرض سے ایجاد کیا گیا۔ کیا اثر ڈالا
کیا نتائج پیدا ہوئے۔ قدیم اور جدید حالتوں میں کیا فرق اور کتنی ترقی اور کتنا تنزل ہوا
کس زمانہ میں کیا کیا اصلاح ہوئی کوئی بات متروک ہوئی تو کیوں اور کسی بات تیز
میں نقص رہا تو کیا سبب۔ اصلاح و ترقی کے اسباب کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یورپ نے ایشیائی علوم میں فلسفۂ عقلی کی ایک نئی روشنی اضافہ کی ہے ہمارے یہاں تاریخ ایک عام فن تھا جو اجمالی واقعات کا دفتر ہوتا تھا۔ اب یورپ نے تاریخ کو فلسفہ کی عقلی ایک عام شاہراہ بنا دیا ہے۔ جس سے حکیمانہ طور سے کلیات علمی کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔

مولوی غلام الثقلین صاحب بی اے ناظم تعلیمات گلبرگہ شریف علاقہ حیدرآباد نے جو علیگڈھ کالج کے لایق گریجویٹ ہیں اصُول تاریخ پر ایک نہایت قابل قدر مقدمہ لکھا ہے جو ہمارے مورخین کے علاوہ آئندہ کو زیر نگاہ ہونا چاہیئے۔ یورپ نے سنسکرت بھاشا ۔ عربی فارسی کے علوم و ادب پر بھی فلسفیانہ نگاہ ڈالی ہے ۔ جرمن سنسکرت اور بھاشا کو خاص طور پر دیکھا ہے ۔

فرانس نے عربی اور فارسی پر خاص نگاہ ڈالی ہے ۔ انگلستان میں بڑی بڑی کتابوں کو فلسفۂ عقلی سے جانچا گیا ہے ۔ من حیث المجموع ایشیا کا تمام ریکارڈ وغیرہ یورپ کے پیٹ میں دیکھا جاتا ہے اور چھاپے کی ایجاد نے اُسکو اور بھی ارزاں کر دیا ہے ۔ عربی کے فن ادب میں پہلے ہمارے یہاں صرف مقامات حریری متنبی سبعہ معلقہ درس میں داخل تھے اور بعض لوگ تیموری اور نفحۃ الیمن بھی پڑھتے تھے اور یہی ہمارا معمولی سرمایہ تھا ۔ اب شام مصر بیروت استنبول وغیرہ میں چھاپہ کے سبب سے اشعار عرب کا بے انتہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے ۔ شعرائے جاہلیت میں سے امراء القیس ۔ زہیر بن ابی سلمی ۔ لبید بن ربیعہ العامری نابغہ ذبیانی ۔ علقمۃ الفحل ۔ عروۃ بن الورد ۔ حاتم طائی ۔ اوس بن حجر غسانی عنترہ بن شداد العبسی ۔ طرفۃ بن عبد بکری حارث کے دیوان چھپ گئے ۔ قبیلۂ ہذیل کے شعراء کا کلام ایک مجموعہ میں چھاپا گیا ہے خلیفہ منصور عباسی نے خلیفہ مہدی کی تعلیم کے لئے اشعار عرب کا جو مجموعہ تیار کرایا تھا اور جسکو علامہ مفضل نے جمع کیا تھا چھپ کر شائع ہو گیا ہے ۔ ان قصید سے جو مختارات اشعار العرب کہلاتے ہیں ۔ پورے چھپ گئے ہیں ۔ جمہرۃ العرب شائع ہو چکا ہے ۔ ابن الشجری

مستند ہیں حطیئہ۔ عمر بن ابی ربیعہ۔ اخطل فرزدق۔ ابو محجن ثقفی کے دیوان چھپ گئے ہیں اور زمانہ بعد کے شعراء کا کلام تو نہایت کثرت سے شائع ہو چکا ہے عباس بن الاحنف۔ صریع الغوانی۔ عبداللہ بن المعتز۔ ابو تمام۔ ابو عبادہ بحتری۔ ابو العتاہیہ ابو فراس۔ ابو نواس کہ ان میں سے ہر ایک فن شعر کا امام تھا سب کے دیوان چھپ چکے ہیں۔ ان کے سوا ادب کی وہ کتابیں جن میں کثرت سے اشعار عرب مذکور ہیں۔ بکثرت شائع ہو چکی ہیں۔ (دیکھو مولانا شبلی کی کتاب رسائل) ہمارے ادبائے ہند میں میر غلام علی آزاد بلگرامی نے وہ کام کیا کہ دوسرے کسی سے نہیں ہوا۔ یعنی سنسکرت اور بھاشا کی تشبیہات اور استعارات کو عربی کی شاعری میں داخل کیا۔ آزاد بلگرامی کے دیوان کا نام سبحۃ المرجان ہے اور وہ بھی استنبول اور بیروت میں چھاپا گیا ہے۔

مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے فیضی کی تفسیر سواطع الالہام بے نقط چھاپ کر احسان کیا ہے۔ سنسکرت کی شاعری تبرک کے طور پر باقی ہے لیکن بھاشا کی لائبریری سینکڑوں کتابوں سے معمور نظر آتی ہے۔ فارسی میں سینکڑوں مثنویاں اور دیوان چھپ گئے ہیں۔ اور سینکڑوں مثنویاں اور دیوان قلمی پائے جاتے ہیں۔ اور اب فارسی کے علاوہ اردو میں ایک بڑا ذخیرہ ادب اور شاعری کا بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اب تک ہماری شاعری یورپ کے فلسفہ عقلی کے ساتھ فلاسفی کی میزان میں تولی اور فلاسفی کی کسوٹی پر جانچی نہیں گئی اور اس کی بڑی ضرورت ہے کہ فلسفۂ تاریخ کی طرح شاعری کی فلاسفی پر ایک نہایت گہری نظر ڈالی جائے اور شاعری کی ہر کتاب کو فلاسفی کی روشنی سے دیکھا جائے اور ہماری شاعری کی کتابوں پر جو تقریظیں اور ریویو لکھے جائیں وہ مغربی اصول پر لکھے جائیں اور ہمارے فاضل مصر بطرس ایک جوش کے اس سمندر کی گہرائی سے جواہر گرانمایہ نکالنے والے ہوں۔ خدا ما صفا ودع ما کدر۔

ہماری شاعری کا موضوع حقیقی

ہمارے یہاں موضوعِ شاعری پر کوئی مستقل کتاب نہیں بلکہ علم بیان اور عروض و قوافی کے ذکر کے ساتھ کہیں اجمالاً اس کا بھی ذکر آ پڑا ہے وہ بھی ایسا جس سے کوئی وسیع رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک شاعری کے تین اصول ہیں۔ عشق۔ ادراک۔ حسن۔ اور جو ان کے علاوہ ہے وہ انہیں کے تحت یا متعلقات میں ہے۔ جب ان تینوں کا ادب شناس ہو تب پورا شاعر بن جا سکتا ہے۔

شاعری کی تثلیث

ادراک

عشق

حسن

شاعری ادب کی پوئیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور فلاسفی کا پرائیویٹ آفس ہے۔ شاعری ایک ستاری ہے وہ ہے جسکے اندر خیال کا بازیگر روحانی کیفیتوں کا جسمانی صورتوں میں اور جسمانی حالتوں کا روحانی صورتوں میں تماشہ دکھاتا رہتا ہے جو حقیقت اور مجاز کے رنگوں سے رنگا گیا ہے۔ شاعری کا بڑا کمال حقیقت اور مجاز کی دو حالتوں کا تماشا ایک صورت میں دکھانے کا ہے۔
ایشیائی شاعر کا مذاق خاص یہ ہے کہ ایک بات کو پھیر کر دوسرے معنی پیدا کر دیئے جائیں اور راز کی بات علانیہ طور پر نہ کھلنے پائے۔ میخانے کو جائیں شکر [illegible] دیکھ لے تو مسجد کی بات بنا سکیں ؎

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

شاعری کا بڑا تعلق شاعر کے جذبات وجدانی اور انوار رہبانیت کے برکات روحانی سے ہے۔ اور ہماری روح کا روح اعظم کی جانب میلان ہونے اور ترقی خیال کے لئے ایک لازمی اثر ہے ؎

پانی تہ خاک کو رواں ہے
نو شعلہ کی سوئے آسمان ہے

اور چونکہ شاعر باطنی جذبات اور روحانی طاقت سے اپنے خیال کو بلند کرتا ہے۔ اور وہ ارتقا خیال کے لئے انتہا کا درجہ ہے۔ اس لئے عالم بالا کی جانب شاعر کے روحانی جذبات کا ایک سلسلہ قائم ہونا لازمی ہوتا ہے اور اپنے ارتقا کمال کے مقام پر پہونچکر اس کی روح جو دیکھتی اور سمجھتی ہے اس کے لطائف اور حقائق کو شعر میں ادا کرتی ہے۔ نظم میں لطافت معنوی کی نثر سے زیادہ سمائی ہے جیسے نمک میں جو نمکینی ہے وہ شے میں نہیں۔ پھول کی خوشبو درخت میں نہیں پائی جاتی۔ اسی لئے نفس بالطبع نظم کو نثر سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ موسیقی کی طرح نظم بھی دلپر اثر کرنے والی چیز ہے اور ایشیا نے مقام معرفت میں ہزاروں برس جبہ فرسائی کی ہے تب یہ مذاق پیدا ہوا ہے ؎

سونا کیا حرام تو قسمت جگائی ہے
جب خاک ہو گئے ہیں تو اکسیر پائی ہے

اور چونکہ شاعری حفظ اسرار کا خاص ظرف رکھتی ہے۔ اس لئے تمام ایشیائی زبانوں میں شاعری کو خاص طور سے اسرار حقیقت کا اہل سمجھا گیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے تازہ ہائے معرفت شاعری ہی کے پردہ میں ادا کئے جاتے ہیں دیکھو مولانا روم کی مثنوی اور شمس تبریز اور حافظ شیرازی کے دیوان ؎

ہو رہا آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

شاعری اور تصوف

سنسکرت عربی - فارسی میں ہزاروں برس پیشتر اسباب کا پتہ لگتا ہے کہ
الٰہیات اور مذہب کو مختلف نوعیت سے شاعری کے ساتھ تعلق رہا ہے اور شاعری
نے اس کو اپنی دلچسپی کا خاص ذریعہ سمجھا ہے - لیکن ہم کو بہت پرانے زمانہ کی یاد
کرنا منظور نہیں بلکہ ہم ہدایت اسلام سے اس بات کا کھوج لگانا چاہتے ہیں - کہ
مذہب کو شاعری سے اور شاعری کو مذہب سے کیا تعلق رہا ہے - اور شاعری
نے اس میں کیا اثر پیدا کیا ہے - اس کی دو صورتیں ہیں - ایک یہ کہ مذہب کے احکام
اور اسلامی دنیا کے واقعات صاف صاف لفظوں میں نظم کر دئے گئے ہیں جن میں زیادہ
تر اصل مقصد کے ظاہر کرنے سے سروکار رہا - دوسرے وہ جو مذہب اسلام کو دوسرے
پیرایہ میں لیجا کر اس کو شاعری کا جولانگاہ بنایا گیا - جیسے تصوف کی ایک
مناسبت پیدا کی اور پھر شاعری کو تصوف کے کام میں خرچ کیا - کیونکہ شاعری کے
لئے اس سے بہتر کوئی جادہ پیدا نہ ہو سکتا تھا اور نہ تصوف شاعری سے بہتر دوسرا
لباس پا سکتا تھا - تصوف کا مذاق ہر زبان میں پایا جاتا ہے - اور ہارون رشید
اور مامون رشید کا زمانہ ہر مذہب کے جمع کرنے میں لاثانی گذرا ہے - اس لئے
سنسکرت اور فارسی نے عربی پر ایک جدید اثر نمایاں کیا اور شاعری میں تصوف
کی چاشنی کو ہر مذہب کے لئے قبولیت سے دیکھا - اور مسلمانوں میں بڑے بڑے شیوخ
کبار کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا - یہاں تک کہ امام المتکلمین امام غزالی جیسے مقتدا
نے تصوف کے روحانی مقامات کو تمام شریعت کا بنیادی پتھر کہہ کر ان کو بہت تعلیم و
تکریم سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ایسے مقامات ہیں جن کے رموز اور اسرار کو اہل دل
ہی سمجھ سکتے ہیں اور ان کو بیان کرنا دشوار ہے - اس لئے کہ کوئی لفظ جب تک
اس حقیقت سے متعلق نہ ہو تو اس کے لطائف کو بیان نہیں کر سکتا اور جو بیان کیا جاتا ہے وہ
[illegible]

کے معلوم نہیں ہوسکتی اور بنا اُس کا لطف کسی ایسے شخص کو جس نے پانی نہیں پیا بتایا جاسکتا ہے اور اسی لئے ہمارے معنے فہم سخن طراز کی سحر نگاری احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ تصانیف کے ان مقامات میں جو واردات قلبی اور کیفیات روحانی سے متعلق ہیں دیکھنے کے لائق ہے جن کے لکھنے کے لئے دوسرا غزالی نظر نہیں آتا۔ اور وہ فقہی لٹریچر کا معجزہ ہے

ہر بانگ بیاید ایں نوا را
ہر کوہ نتابد ایں صدا را

اب میں اجمالاً تصوف کے بعض مقاصد کو جو ہماری شاعری سے وابستہ ہو گئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ ہماری شاعری کی روح رواں بن گئے ہیں۔ بیان کرتا ہوں پروفیسر راس آکسفورڈ لندن کہتے ہیں کہ اہل راز کا مذہب دنیا بھر میں ایک ہی سا ہے لیکن یہ بے تکلف بات مشکل سے جی ہاں کہدینے کے لائق ہوگی۔ میرے نزدیک اسلام میں جو کام متکلمین نے کیا اور جس وادی میں سرسید احمد خاں کی عمر گذری اس کا لطف اہل استدلال سے پوچھا چاہیئے ایسے ہی اسلام کی صاف اور سیدھی باتوں کو جس باریک نگاہی سے ارباب تصوف نے دیکھا اور جس لاثانی طریق سے مضمون اسلام کو بلند کیا وہ ان کا حصہ ہے اس کلام میں ان کا بڑا کمال یہ ہوا کہ صوفیہ متکلمین نے اسلام سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اسلام کے ایک ایک لفظ کے دوسرے معنی کہکر اسلام کی ڈکشنری میں ایک عجیب اضافہ کیا۔ اور طریقت ــــــ کو حقیقت کا خاص موضوع بتایا اور جیسے حکیموں نے دماغ کو مخزن حکمت بنایا تھا ویسے صوفیوں نے دل کو معدن طریقت خیال کیا اور ساری طاقتیں دل کی زندگی میں صرف کیں۔ ہمارے موجودہ زمانہ کو یورپ اور ایشیا کے حکیموں کے اقوال اور علماء تصوف کے خیالات سے دل و دماغ کے افعال پر ایک بہت بڑی چھان بین سے کام لینے کی ضرورت ہے اور دل کی تحقیق میں ان کو فیثاغورث اور اہل راز کے مجامع و تصانیف سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے اور اب یہ خیال کسی کے بجھتے ہوئے چراغ تیر سے بہت مشابہ ہے جس میں تیل نہیں اور اس کی بتی بھی تمام ہو چکی ہے۔ لیکن اسکی

دھندلی روشنی بھی لعل شبچراغ سے کم قابل قدر نہیں۔ عام تصرف کا یہ مقصد بیان کیا جاتا ہے کہ اُس اصول پر کاربند ہونے سے ہماری روح اوج گرا ہو کر اوس روح اعظم میں جا کر لمجائے جو تمام عالم کو سادھے ہوئے ہے۔ اُس کا اعتقاد ہے کہ خدا کا سب سے اچھا پتا اگر کہیں مل سکتا ہے تو انسان میں اور اس پر حضرت علی کے قول کو حجت لاتے ہیں۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ اور صوفی منطق اور استدلال کے بدلے مراقبے اور استغراق کے شاہدات اور تجلیات اور الہامات کے حاصل کرنے کے لئے نفس کو مارنا۔ دنیادی اور جسمانی خواہشوں کو دبانا لازم جانتے ہیں اور یہ حالتیں ان کو ایک بیخودی کی کیفیت کا مزا دینے والی ہوتی ہیں۔ اہل سلوک کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری دوسرا عملی۔ نظری وُہ جو حقیقت اشیاء تک پہونچنے کی سعی ہے اور عملی وُہ جس کا مقصد اِس اکبر الاکابر سے وصال حقیقی ہونے کا ہے۔

اہل راز کے پیش نظر جو سب سے قوی خیال ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ وُہ یہ ہے کہ تمام چیزوں میں ایک ذات واحد جاری و ساری ہے جو کچھ ہے وہی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مذہب ہمہ اوست اور مذہب ہمہ از اوست میں بہت بڑا فرق ہے مذہب ہمہ اوست فرض کر لیتا ہے کہ انسان میں پہلے ہی سے الوہیت کے تمام خواص موجود ہیں جس پر منصور کا افسانہ طشت از بام ہے۔ اور مذہب ہمہ از اوست کا خیال اسکے خلاف یہ ہے کہ انسان خدا سے جُدا ہو گیا ہے۔ اسی لئے توحید ذات نہایت ضروری ہے جو کتابیں تصوّف یا تصوّف کے مذاق میں لکھی گئیں ان میں مولانا روم کی مثنوی اور شمس تبریز اور حافظ شیراز اور فرید الدین عطار اور ملا جامی کے دواوین اور امام غزالی کے ملفوظات اور ہندوستان میں خواجہ میر درد اور میرزا مظہر جان جاناں اور امیر خسرو کے تبرکات اس روئے زیبا کے لئے آئینہ کا کام دیتے ہیں اور ایک ہزار سال سے مسلمانوں کی تصنیف میں تصوّف اور صوفیانہ مذاق کا کھلا ہوا پتا ملتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کتابیں لکھی گئیں ہوں جو ہمارے دیکھنے میں نہیں آئیں یا زمانہ نے ان کو برباد کر دیا۔ چنانچہ ابوالخیر ابو سعید ۹۶۸ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے فارسی کی نظم

اور نثر دونوں میں تصوف کی کتابیں تصنیف کیں جو آکسفورڈ لنڈن کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

ابوسعید اور بوعلی سینا دونوں ہمعصر ہیں۔ بوعلی سینا کا قول ہے کہ جو ابوسعید دیکھتا ہے وہ میں جانتا ہوں اور ابوسعید کہتے ہیں کہ جو بوعلی جانتا ہے وہ میں دیکھتا ہوں۔ ابوسعید کے اقوال میں ہے کہ جوں جوں انسان دنیا سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ خدا سے ناواقف ہوتا جاتا ہے اور تصوف کا ایک مقولہ بھی ہے کہ العلم حجاب الاکبر۔ ابوسعید نے صوفیانہ نظم میں وہ خاص لطف پیدا کیا جو شاید اس سے پہلے کی تصنیف میں نہ ہو وہ عجیب عجیب استعاروں میں خدا کو معشوق یا ساقی یا شمع سے اور انسان کو عاشق یا میخوار یا پروانہ سے تشبیہ دیتے ہیں صوفیانہ کلام میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کی تمیز و تفریق کرنا دوسرے کے اندازہ فہم اور حسن ظن سے متعلق ہے۔ بعض وقت یہ تمیز نہیں ہو سکتی کہ وہ اخلاق کی باتیں کہہ رہا ہے یا فلسفہ کی۔ تصوف کا عام اصول یہ ہے کہ سب چیزیں خدا سے نکلیں اور خدا میں جائیں گی۔ جگہ جگہ یہ خیال ملتا ہے کہ سب مذہب اور ساری دین ایک ابدی سورج کی کرنیں ہیں۔ سارے نبیوں نے اسی ایک ابدی حسن اور ابدی حقیقت کے مسئلہ کو مختلف زبانوں میں بیان کیا ہے صوفیوں کو نہ صلہ کی پروا ہے نہ سزا کا خوف۔ بہشت ان کے لئے حسن ہے اور دوزخ خدا کا جلال۔ موتو قبل ان تموتو۔ اور فنانی اللہ اس کی تعلیم دو عملی سبق ہیں۔

صوفیوں نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ سمجھا ہے۔ جو حسن ہم دنیا میں دیکھتے ہیں۔ صورت کا ہو کہ عادت کا کہ خیالات کا نور حقیقی کا ایک عکس ہے اور ریاضت اور نفس کشی سے اس نور کے ساتھ وصال ہونا ممکن ہے۔

تصوف کے تین درجے ہیں پہلا درجہ شریعت ہے جس کا یہ مقصد ہے کہ طالب اسلامی تعلیم حاصل کرے پھر دوسرا درجہ طریقت ہے صوفی یہاں آکر سمجھتا ہے کہ

یہ جو ظاہرا طریق عبادت کے ہیں یہ صرف عوام کے لئے ہیں جن کو باطن سے آگاہی نہیں ہوتی ۔ تیسرا درجہ یقین ہے ۔ یہاں پہونچکر صوفی خدا سے واصل ہو جاتا ہے ۔ جتنے بڑے بڑے شعرا ایران میں گذرے ہیں اُن سب کا کلام متصوفانہ تھا اسکی وجہ یا تو یہ کہ وہ واقعی صوفی تھے یا یہ کہ عادتاً اُن سے اس قسم کا کلام صادر ہوتا تھا یا شاعری کا سانچہ ہی اس ترکیب سے تیار کیا گیا کہ اوس میں چربی ۔ کافور اور دوسری پگھلنے والی جو چیز ڈالو وہ وہی صورت حاصل کر کے نکلے مگر دوسرے قسم کے شاعروں کا اصلی مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناقص کمال کو دوسروں سے چھپائیں اس لئے وہ ایسی اعلےٰ اور مقدس سوسائیٹی میں مل بیٹھنے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں اور ایسی غلتی ہوئی آواز سے بات کرتے ہیں کہ معمولی طور سے پہچاننا مشکل ہو ۔

صوفیوں کے نزدیک سب عالم خدا سے نکلا ہے اور پھر اُسی میں جا ملے گا ۔ جیسے سورج برابر شعاعیں پھینکتا اور پھر اُنہیں اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے ۔ نہایت بدیہی اور آسان مثال یہ ہے کہ خدا بمنزلہ سمندر کے ہے اور صوفی اُس میں ایک قطرہ ہے ۔ ایک اور قول بھی ہے کہ میں (یعنی خدا) پوشیدہ خزینہ تھا ۔ میں نے چاہا کہ ظاہر ہوں اسلئے میں نے اپنی صورت پر انسان کو پیدا کیا اس کلام سے صوفی عالم کو خدا کا مظہر ہونا خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام اجسام بطور آئینہ کے ہیں جنمیں خدا کی جلوہ گری ہوتی رہتی ہے اور آئینے کے ٹوٹ جانے سے اسکو کوئی نقصان نہیں ہو سکتا ۔ اخیر میں صوفیوں کا خیال ظاہر کرنے کے لئے ملا جامی کی ایک نظم کا ترجمہ کیا جاتا ہے ۔

"عدم تھا اور خاموشی ۔ اُس میں ایک وجود تھا اکیلا ۔ سوا اُس کے کوئی اُس کی خوبیاں دیکھنے والا نہ تھا آئینہ نہ تھا کہ اُس کا حسن دکھاتا شانہ نہ تھا کہ اُس کی زلفوں کو سلجھاتا صبا نہ تھی جو گیسوؤں کو حرکت میں لاتی سرمہ نہ تھا کہ آنکھوں کی مشاطگی کرتا ۔ کسی نے وہ سوہنی صورت نہ دیکھی تھی وہ خود ہی معشوق تھا خود ہی عاشق حسن تھا اور خلوت ۔ لالہ کو دیکھو موسم بہار

ہیں کیسا بن سنور کر نکھرا ہوتا ہے۔ گُل کو دیکھو کیسا اترا اترا کر اپنا جوبن دکھاتا ہے
بس تو حسنِ ازل نے چاہا کہ ظہور ہو۔ فوراً ایک تجلی تھی کہ سارے عالم میں پھیل گئی
ذرّہ ذرّہ سے آئینہ ہر کر اس نور کا پرتو دکھایا۔ گُل میں وہ حسن آیا کہ بلبل دیکھتے
ہی ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ شمع کو وہ فروغ ہوا کہ پروانہ تصدق ہونے لگا
یہ سب کچھ نقاب ہے اور نقاب کے پیچھے ایک محبوب۔ محبوب کی محبت ہماری زندگی
ہے سب کچھ محبوب ہی ہے۔ تو ایک آئینہ ہے جس میں خود بخود عکس ہوتا ہے اور
پھر وہ بھی نہیں بلکہ وہی صورت ہے وہی آئینہ۔ مُلا جامی کی تحفۃ الاحرار میں اس
مطلب کے متعلق یہ اشعار درج ہیں ؎

شاہدِ خلوت گہِ غیب از نخست — بود پئے جلوہ کمر کرد چست
آئینۂ غیب نمایش داشت — جلوہ نمائی ہمہ با خویش داشت
ناظر و منظور ہم او بود و بس — غیر وے ایں عرصہ نہ پیمود کس
جملہ یکے بود و دوئی ہیچ نہ — دعوئے مائی و توئی ہیچ نہ
گرچہ ہمی دید در اجمالِ ذات — حسنِ تفاصیلِ شیون و صفات
خواست کہ در آئینہ ہائے دگر — بر نظرِ خویش شود جلوہ گر
روضۂ جاں بخش جہاں آفرید — باغچۂ کون و مکان آفرید
کرد ز ہر شاخ و گل و برگ و خار — جلوۂ او حسن دگر آشکار
سرو نشاں از قدِ رعناش داد — گل خبر از طلعتِ زیباش داد
سبزہ بگل غالیہ تر سرشت — پیش گل اوصاف خط او نوشت
فاختہ با طوق تمنائے سرو — زد نفسِ شوق نہ ز بالائے سرو
بلبلِ نالندہ بدیدار گل — پردہ کشا گشت ز اسرار گل
کبک دری پا بچپا بر زدہ — زد بسر سبزہ قدم سر زدہ
قمری بنہادہ بہ شمشاد دل — سوخت بہ داغ غمِ شمشاد دل
حسن ز ہر جا کہ زد القصہ سر — عشق شد از جائے دگر جلوہ گر

قالب و جانند بہم حسن و عشق　　گوہر و کانند بہم حسن و عشق
از ازل این ہر دو بہم بودہ اند　　جز بہم این راہ نہ پیمودہ اند

ہستی ما ہست ز پیوند شاں
نیست کشادِ ہمہ جز بند شاں

اُردو کی خانقاہ میں ایسے ترانوں کی آوازیں نہیں گونجتیں - اور نہ اُردو کو تصوف کی خانقاہوں میں حال و قال کا اتفاق ہوا لیکن جن قلوب میں یہ آگ بھری ہوئی تھی اُن سے بغیر شعلہ افروزی کے نہ رہا گیا - چنانچہ منشی امیر احمد صاحب مینائی اور مولوی محمد محسن صاحب کاکوروی کے مقال میں اس قسم کی کافی چاشنی موجود ہے اور دوسرے دواوین بھی خالی نہیں ہیں دوسرے حصہ میں اُن کا اقتباس پیش کروں گا - یہاں جناب محسن کے دو تین شعر انکی مثنوی صبح تجلے سے نقل کرتا ہوں جس سے کلام کی فصاحت معلوم ہو اور شاعری کا خرقہ تصوف صوفیانہ رنگ میں منزا بور نظر آتے ہ

عالم میں وہی ہوا ہے چلتی　　جو صبح الست کو چلی تھی
توحید ہے مستِ نغمۂ ہو　　ہنگامۂ لا الہ ہر سو
گم نور وجود میں عدم ہے　　آغوش حدوث میں قدم ہے

بادشاہ

خدا کے بعد اُسی سلطنت کا چربا شاہی دربار میں نظر آتا ہے اس لئے ہر زبان میں بادشاہ کے لئے ایسے مصطلحات مقرر ہیں جن سے بادشاہ اور خدا میں ایک نسبت خاص پائی جاتی ہے جیسے عربی میں خدا کا سایہ - انگریزی میں آسمان کا نور ہندی میں خدا کا مظہر وغیرہ وغیرہ اور بادشاہ کا دربار خدا کی سرکار کا ایک دوسرا خاکہ چربا عکس بنا لیا گیا ہے اور اُسکی درگاہ اقسام ادب کا مجمع ہے اس لئے اسکو تمام لوازم کو نظم کے ساتھ خصوصیت معنوی ہے اور پالٹکس کے تمام اسرار جو شاعری کے پردوں میں ادا ہو سکتے ہیں وہ اُس اخفا د احتیاط سے نثر میں ادا نہیں ہو سکتے

یا اُن کے نثر میں ادا کرنے سے وہ لطائف پیدا نہیں ہوتے جس کا ایک رخ واقعات
کی جھلک دکھاتا ہوا اور دوسرے معنی اور سپر پالٹیکس کی پردہ ڈالتے ہوں۔ یہ مقام بہت
باریک ہے اور شاعری کے حاصل شعر اور نفاست فکر کا ماحصل المطلوب اسی مقام کو سمجھنا
چاہئے۔ یہ مقام ایک ناظم کا مقام نہیں جو موزونیت طبع سے شعر موزون کر لیتا ہے
جیسے ایک عالم عام علوم کے ساتھ طب پڑھتا ہے۔ لیکن حکیم عبدالمجید خاں اور شفاء الدولہ
نہیں بن جاتا اور یہ ادراک بھی عام نہیں بلکہ مبدء فیاض سے جس دماغ کو جتنی فراست عنایت
ہوا اُسی کو شعر میں لا سکتا ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وزارت کے عہدہ پر ہر شخص معمور رہ سکتا ہے لیکن ابوالفضل علامی گلیڈ اسٹون۔
بسمارک۔ سالار جنگ۔ جعفر برمکی خالد نہیں ہو سکتا ہر کالج کا سکرٹری۔ سکرٹری
کہلائے گا۔ لیکن سر سید احمد خاں۔ اور نواب محسن الملک کا دماغ کہاں سے لائیگا
ایسے ہی ہر شخص شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن موضوعات اور محسوسات شاعری کے
اقسام مؤثرات کو اُس طاقت سے زیادہ ظاہر نہیں کر سکتا جو اُسکے دل اور
دماغ میں ہے تاہم جو مطالب عام شاعری کے دستور العمل اور ضابطہ کلی کے موافق
بیان کئے جائیں۔ اُن سے بھی ایک قابل قدر دلچسپی کی رہنمائی ہوتی ہے جیسے کوئی
عہدہ دار اپنے ضابطہ مقررہ کے موافق کام چلائے اور اُس سے کوئی خاص بلند خیالی
ظاہر نہ ہو لیکن عام بدنظمی اور بیضابطگی سے پاک ہوگا۔ کیونکہ شاعر کو شاعری کا سانچہ
اور اسکے اصول موضوعہ ہر طور پر معائب سے بچاتے اور حسن کلام کی راہ دکھاتے
ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کیمسٹ گنگا کی ریت سے سونا نکالتا اور نہایت حقیر چیزوں
سے بڑے بڑے کام کی چیزیں پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح شاعری سے فائدہ اٹھانے
کے لئے ایک کیمسٹ کی نگاہ پیدا کرنا چاہئے۔ ایشیائی شاعری ایک نہایت قابل
قدر دفینہ ہے۔ جب اس کو کھود کر عمیق نظر سے دیکھوگے تو اس میں چاندی سونا

ہیرا لال موتی وغیرہ طرح طرح کی قیمتی اور بیش بہا چیزیں تم کو دستیاب ہونگی - اور جو ٹھیکریاں ہونگی اُن سے کبھی سونے کے ذرات پیدا کر سکو گے اور جو چیز ہیں اس سے خالی ہے وہ شاعری نہیں ہے -

حُسن

اے حُسن عجیب چیز ہے تو — پیارا ہے تو عزیز ہے تو
خالق نے اثر دیا ہے تجھکو — نیرنگ سے بھر دیا ہے تجھکو

خدا اور بادشاہ کی طرح حسن بھی شاعری کا ایک زبردست عنصر ہے عشق و عاشقی کو اُسکے توابع میں سمجھنا چاہیے جیسے شمع روشن ہوئی اور پروانے آ موجود ہوگئے - اور مظاہر حسن اور مناظر حسن لاتعداد و لاتحصٰے ہیں جو جسکو بھاتے اور جہاں جس کا دل لگ جائے اسمیں مدرکات روحانی اور محسوسات جسمانی دونوں کو دخل ہے - اور خدا اور بادشاہ دونوں کے انوار و اسرار کے رموز و دقائق کا لحاظ کیا جاتا ہے اور وہی نسبتیں اسکے لئے پیدا کیجاتی ہیں - حُسن کے لئے ایک خاص پالٹکس ہے جو مروت عاشق و معشوق کے درمیان اپنے جذبات باطنی اور کیفیات طبعی کے اظہار کو کام میں لایا جاتا ہے - وُہی اسرار - وُہی انوار - وُہی راز - وُہی نیاز - وہی داب - وُہی آداب - ایک دوسری صورت میں نمایاں ہوتے ہیں اور خدا کی مناجات اور بادشاہ کے قصیدہ کی طرح یہاں غزل سے کام لیا جاتا ہے - غزل کے معنے کیا ہیں - سخن با محبوب گفتن -

جناب نواب عماد الملک مولانا سید حسین صاحب بلگرامی نے علیگڈھ کالج میں جو اسپیچ کہی وہ مقصود شاعری کا اصلی جوہر ہے اور وہ اسپیچ اعجاز البشیر اٹاوہ ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء میں چھاپی گئی ہے - اس میں عالی دماغ اسپیکر نے حسن کی نسبت فرمایا ہے -

"تم نے یونانیوں سے سب کچھ حاصل کیا مگر سب سے زیادہ بیش قیمت چیز کو چھوڑ دیا یعنی ہم میں اُس یونانی روح کا نام و نشان نہیں پایا جاتا جو موجودہ زمانہ کی

نئی زندگی اور تعلیم و تربیت کی رگ رگ میں اس طور سے حاوی ہوئی ہے جیسے گلاب کے پھول میں خوشبو۔ سو بجز علم اخلاق یونان کی حسن پرستی کا ایسا ممنون نہیں ہے جیسا کہ دیگر علوم کا جو براہ راست اخلاق پر اثر ڈالتے ہیں کیونکہ نیکی اور حسن میں بہت گہرا تعلق ہے اور ہم اس سے واقف نہیں وہ تربیت یافتہ اور فارغ البال زندگانی جو فنون لطیفہ مثل علم البیان اور تو اقب حسن نخواہ کسی صورت میں ہو کا ثمرہ ہے۔ ہم میں بالکل معدوم ہے۔

اس اتیچ کی معنوی توضیح کے سمجھنے کو کوئی خاص کتاب ہمارے سامنے نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اس خیال کے ماخذ کا پتہ لگایا جائے تو ایشیائی شاعری سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے جس سے شعر کے مجامع خالی ہوں گے۔ ہاں ایک مذاق سلیم کے موافق انتخاب اور اقتباس کی ضرورت ہے اور نیز یہ کہ اُن اشعار پر جدید مذاق کے موافق حکیمانہ توضیحات کا حاشیہ چڑھایا جائے جیسا کہ سرسید نے بعض لٹریچر کے معنوی مقاصد کو دوسرے قالب میں لاکر مذاق جدید کے موافق بنانے میں کوشش کی ہے اور وہ کوشش ایک خاص حد تک مقبول عام ہوئی ہے۔

ملکاتِ شاعری

ابتداء میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کے دل پر مناظر حسن کی تجلّیاں اپنا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اور ایک شاعر تین صورتوں میں اکتسابِ فن کرتا ہے۔ پہلے کتابوں کے ذریعہ سے مشق سخن کرنا دوسرے کسی آشفتہ حال کے حالات ماندادی پر مطلع ہوکر اُن کو نظم کا لباس پہنانا تیسرے خود روئے زیبا کا محو دیدار ہوکر اسکے جذبات اور واقعات کو شعر میں ادا کرنا۔ ایسے ہی بادشاہ سے متعلق تین مقام ہیں ایک سعدی کی گلستان یا اخلاق ناصری اور انوار سہیلی اور شاہنامہ پڑھکر اُس کی حقیقت کو سمجھنا۔ دوسرے درباری مذاق کو اہل دربار سے سنکر اُس کا چربا اتارنا۔ تیسرے خود دربار میں شریک ہوکر ہر چیز کو آنکھ سے دیکھنا۔ اور ہر بات کو کان سے سُننا اور پھر اسکو شعر میں ادا کرنا

اور بادشاہ سے اور پرخدا کے مقام معرفت کا اکتساب بھی تین ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے
ایک معرفت کی کتابوں کو دیکھنے سے دوسرے کسی صوفی اور شیخ وقت سے اسرار
باطنی کا علم حاصل ہوتا تیسرے خود مقام معرفت تک پہونچکر شاعر بنیا۔ اور شاعری
تین قسم کی ملکات طبعی پر مشتمل ہے۔

(۱) ابتدائی قسم کا ملکہ شاعری اُن کیفیتوں سے حاصل ہوتا ہے جو آنکھ ناک کان اور دوسرے
قوائے سے دل اور دماغ میں وارد ہوتی ہیں۔ اور اُن سے ایک قسم کے جذبات
باطنی کا ہیجان ہوتا ہے۔ یہ وُہ مقام ہے جسکو مظاہر قدرت اور مناظر فطرت سے
جیسے گل و بلبل۔ ریحان و سنبل۔ خط و خال حسن و جمال ظاہری سے دلچسپی یا دلبستگی
ہے۔ ایسے درجہ کے ممتاز لوگوں میں میرزا صائب۔ علی حزین۔ اور اردو میں جناب
داغ وغیرہ کے دیوان قابل ملاحظہ ہیں۔

(۲) دوسرے قسم کا ملکہ شاعری وُہ ہے جو دماغ کی قوتوں کے نتائج اور مدرکات حسیہ سے
فراخور استعداد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا تعلق سلطنت کے اسرار اور پالٹیکس کے مفہومات
سے وابستہ ہے۔ اس درجہ کے لوگوں میں حکیم خاقانی۔ فردوسی۔ میرزا غالب جیسے
سخن طراز داخل ہیں۔

(۳) اور سب سے اعلےٰ درجہ کا ملکہ شاعری جزو نبوت ہے۔ اور وُہ مقام ہے جہاں انوار
یزدانی اور اسرار ربانی کا القا اسکے دل پر ہوتا ہے اور مبدء فیاض سے آپ ہی آپ
اُسکے خیال کے متعلق حقایق کی جلوہ گری شروع ہوتی ہے۔ یہ مقام مولانا روم۔ حافظ
شیرازی جیسے لوگوں کا ہے۔

یہ تین کیفیتیں ہیں جو ایک شاعر کے دل اور دماغ اور اُس کی طبعی سرشت کے حسب استعداد
وقابلیت اُس میں داخل ہوتی ہیں اور باندازہ فہم وقدرت اپنی دیکھی اور سنی سمجھی ہوئی بات کو
شعر میں ادا کرنے سے لطف اٹھاتا۔ اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اکثر ایسا
ہوتا ہے کہ ایک درجہ کا شاعر دوسرے درجے میں رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ اور کبھی اوّل درجہ کے
لوگ نیچے درجہ میں بات کرنے لگتے ہیں۔ اور کبھی نیچے درجے والے بلند مقام میں گم ہوا

ہوتے ہیں۔ چنانچہ اردو میں میرزا غالب اور حضرت امیر مینائی کے کلام سے ہر طرح کا اقتباس کیا جا سکتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اور نجیر شکوہ آبادی کے خیال پر اول درجہ کے مقامات کا سایہ پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان تین حالتوں کے بعد ایک کیفیت وہ ہے جو موزون طبعی یا کلام کو موزون کر لینے سے شاعروں کے ساتھ ملاتی ہے۔ جیسے میں خود ہوں کہ میں نے دس ہزار شعر سے زیادہ موزون کئے ہونگے۔ لیکن اپنے آپ کو شاعر نہیں کہہ سکتا اور ایسے موزون کلام متکلم کو صرف ناظم کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی اس قسم کے لوگوں کو بھی درجات شاعری سے کچھ حصہ مل رہتا ہے۔ لیکن ان کی عادت اُس پر جاری نہیں اور نہ ملکات شاعری بطور عادت کے اُن میں داخل ہوسکتے ہیں۔

اردو اور شاعری

افسوس بدنصیب اردو کو ملکات سہ گانہ شاعری اور اُن تینوں درجات سے جو اوپر مذکور ہوئے کسی ایک ملکہ راسخہ کی تحصیل و تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ نہ وہ طریقت حقیقت و معرفت کے زینوں پر چڑھی نہ اُس نے ملاء اعلےٰ سے کوئی تعلق پیدا کیا۔ نہ اُس کو غزالی اور زمخشری جیسے ائمہ کلام سے مصافحہ کا اتفاق ہوا اور نہ اُس نے مولانا روم اور حافظ شیراز جیسے بہشتی طائرون کو زمزمہ سنج سنا۔ نہ مسجدوں کی جماعت کا سین اُسکی نگاہ سے گذرا۔ نہ وہ مندروں میں ناقوس برہمن کے نغمہ کو پہچاننے والی ہوئی۔ خانقاہوں کو اُسنے بالکل اُجاڑ پایا جہاں اہل حال کی جگہ کچھ ابابیلیں اُڑتی نظر آئیں۔ شاہی دربار تک اُسکی رسائی نہیں ہوئی اور نہ بادشاہی رزم و بزم کی خدمات سے اُسکو ادائے فرائض کا موقع ملا یا یوں کہو کہ اُسکے وقت میں وہ دربار ہی باقی نہ رہا جو ہر طرح کے انسانی مذاق کا مصدر ہوتا۔

پس وہ دونوں اعلےٰ مقام تو یوں نکل گئے۔ اب رہے صرف عشق اور مناظر حسن وہ بھی اعلےٰ درجہ کے مناظر جو مجازات شاہی سے متعلق ہیں۔ بدنصیب اردو کو ذکی کا نصیب نہ ہوئے صرف بازاری معشوقوں سے اردو کی آشنائی کو تعلق رہا۔

جو ماظرِ نماز الدین محمد ور جیسے اولوالعزم بادشاہ کو دیکھنا نصیب نہ ہوئے تھے جن ناظر
نے شاہنشاہ جہانگیر جیسے شاہنشاہ کو بہ سدن اپنا مشتاق بنائے رکھا جو ناظرین قلی خاں
جیسے بہادروں اور آشفتہ حالوں کی زندگیوں کا خاتمہ کرنے والے ہیں۔ ان کی جگہ اردو
کو دلی کے چاندنی چوک۔ اکبرآباد کے کناری بازار۔ لکھنؤ کے امین آباد۔ حیدرآباد کے چار
مینار اور کلکتہ بمبئی کی سڑکوں پر راستہ چلتے دو روپے کے معشوقوں سے کام پڑا ہے

قسمت کیا ہر چیز کو قسّام ازل نے ۔۔۔ جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا ۔۔۔ غم ہم کو دیا سب میں جو مشکل نظر آیا

اس حالت میں طور کی تجلیاں کہاں سے پیدا ہوں۔ اور معمولی پیرایۂ سخن کے سوائے اعلےٰ درجہ کی خودداری اور ادب کا کام کیا۔ جہاں رقیبوں میں تلواروں سے فیصلہ ہوتا تھا وہاں لات جوتی سے کام لیا جاتا ہے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں اردو کی گندہ شاعری یا وہ اردو کو ایشیائی شاعری سے موسوم کر کے اس کو نام دھرتے ہیں ان کو شاعری کی جگہ سوسائٹی پر جہاد کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی اپنی جانب دیکھنا چاہیئے کہ ان کا طرزِ عمل کس حد تک قابلِ نکتہ چینی ہے لیکن یہ اعتراض قانون پر عائد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً سینکڑوں مسلمان شراب پیتے اور فسق و فجور میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ مسلمانوں کا قانون اور ان کا مذہب قابلِ ملامت ہے ویسے ہی اگر بعض لوگ شاعری کو ادب کے حدمیں پورا نہیں کرتے تو وہ شاعری اور قانونِ شاعری کا قصور نہیں۔ اور میں جہانتک غور کرتا ہوں اس کا بڑا سبب ہماری مفتوحانہ حالات اور مردہ دلی اور سوسائٹی کی کس مپرسی اور نامعقول حالتیں ہیں جو ادب کو بے ادبی کا مورد بناتے ہوئے ہیں اور دنیا میں کوئی قوم نہیں پائی جاتی جس کی شاعری بغیر فاتحانہ اثر کے ترقی اور اثر کا دلچسپ اور دل نشین نمونہ بنی ہو یا فاتحانہ حیثیت کے جاتے ہی اُسکے کمال پر زوال نہ آیا ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر قسم کی طبع آرائی کی وہ چیزیں لازمی ہیں۔ جو بغیر فاتحانہ حیثیت کے پیدا نہیں ہو سکتیں یونان مصر۔ شام۔ فارس۔ شیراز۔ بخارا۔ سمرقند۔ بغداد وہی ہیں اور اسی نسل کے آدمی وہی کتابیں پڑھتے اور اسی آب و ہوا میں رہتے ہیں۔ لیکن جدت

خیال اور بلند پروازی کی وہ حالتیں پائی نہیں جاتیں بخلاف ان کے جو ہیں۔ نیز اس انقلاب میں جہاں فتوحات کے دروازے کشادہ ہیں۔ وہاں غوطہ زنی بھی دربلند پروازی کی محشر خیز انگیں بھی ترقی پر ہیں اور اقسام شاعری کے لئے ہر قسم کے نئے نئے نمونے ملتے ہیں۔ میرے نزدیک اُردو شاعری نے جو کچھ کیا اور جو کر رہی ہے۔ وہ سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ یہ بات کہ اُردو نے کیا کیا اور کیا کر رہی ہے اسکو دوسرے حصّہ میں بیان کروں گا جس سے معلوم ہو کہ اُردو نے اس گزشتہ گزینی اور پورپانیتی پر بہرسہ نکات شاعری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں کے مذاق کو کہاں تک اوڑایا ہے۔ جس کو دیکھ کر دوسری زبانیں انگشت بدنداں ہوں۔

مخصات شاعری

(۱) یجوز للشاعر مالا یجوز لغیرہ۔ یعنی جائز ہے۔ شاعر کو جو دوسرے کو جائز نہیں۔
(۲) شاعر بادشاہ کو تو۔ تم سے مخاطب کرسکتا ہے۔ مگر ناثر کو اعلیٰ حضرت قدر قدرت لکھنا ہوگا۔
(۳) سمع کو نظم کا سننا نثر سے زیادہ پسند ہے۔
(۴) شعر کا اثر جانوروں پر بھی ہوتا ہے ؎

اشتر بشعر عرب در حالت است و طرب

(۵) شعر کو موسیقی کے ساتھ ایسا ہی قریبی تعلق ہے جیسے حسن کو نیکی سے۔ خوشبو کو باغ سے۔ روشنی کو چراغ سے۔
(۶) شعر ایک سانچہ ہے جسمیں بیڈول چیز نہیں ڈھل سکتی نہ اُسکے ناپ تول میں فرق پڑ سکتا ہے۔
(۷) ادب کے بھرنے کو نثر سے نظم کا ظرف زیادہ سمائی رکھتا ہے۔
(۸) صنائع شاعری اداے مطلب کو طرح طرح کے پردے ہیں۔ جن کے اندر شاہد معنی کو چھپایا جاتا ہے۔

۱۹ ا سُننے والے کے دل پر نشتر کا اثر زیادہ ہوتا ہے - اسلئے اصُول شاعری سے منشورِ طب
کے بیچ غزل بادشاہ کے لئے تشبیہ اور درگاہ صمدیت کے لئے متعدد مناجات
میں موزوں مطلب کافی حد تک اختیار کیا -

ہماری شاعری کی غزل تشبیہ - مناقب - مناجات کیا ہیں - ایشیائی مذاق کے موافق
منظوم اپدیش ہیں - حسن کی غرض بندہ - بادشاہ معشوق - پیر پیغمبر کی خوشنودی کو اپنی
جانب مائل کرنا اور حسب تمنا مرضی کا مدعا نکالنا ہے -

ہماری قوم میں جو گروہ مولوی کہلاتا ہے - اسکے دماغ میں شاعری کا حصہ نہ آنے
سے اُن کے اوقات میں بلند پروازی کی قوت پیدا نہیں ہوئی اور تعاقب حسن کا مذاق
جس کا ذکر مولانا بلگرامی نے کیا ہے اُن کے دماغوں سے علاحدہ رہا - مگر شاعری کی تہ
میں اُسکی جھلک پائی جاتی ہے - جو موجودہ شاعروں کے حسن مذاق کی تعریف نہیں
بلکہ خود شاعری کے حقیقی مذاق کی تعریف ہے - جس سے شاعر کو خواہ مخواہ اُس دروازہ
سے نکلنے کا اتفاق ہوتا ہے - ہر چند ابھی اُردو میں کوئی ایک شاعر ایسا نہیں ہوا جسکے
کلام کو ہم ایشیائی شاعری کا مکمل نمونہ کہہ سکیں لیکن اگر ہم مختلف شاعروں کے
کلام سے مختلف اشعار کا اقتباس کریں تو ہم ایشیا کے مذاق شاعری کا مکمل نمونہ پیش
کر سکتے ہیں جسکو مغربی دنیا بھی واجب التعظیم سمجھے اور ایسے کئی نام لے سکتے ہیں -
جنکی طبیعتیں ہر قسم شاعری کے نکات - راسخہ کا مکمل نمونہ پیش کر سکتی ہیں جنکو صحیح
طور پر اصل کی نقل کہہ سکتے ہیں -

ہماری شاعری پر اعتراض

اعتراض کئی قسم کے ہو سکتے ہیں ایک وُہ جو اصُول شاعری پر کیا جائے - دوسرے
وُہ جو کسی شاعر کے کلام پر وارد ہو تیسرے وُہ جو اُس شاعری کے مذاق سے متعلق ہو
آجکل دو قسم کے اعتراض پیش ہیں ایک وُہ جو عام شاعروں کی خردہ بینی سے واسطہ رکھتے
ہیں - جیسے ہمارے مخدوم حسان الہند مولانا شوکت ایڈیٹر اخبار طوطی ہند میرٹھ نے عربی

فارسی اُردو کے سب شاعروں کے کلام پر [illegible] کا اثر [illegible]
ہے اور وہ ایسے ہی لوگوں کے [illegible] ہے۔

[illegible]

اور سچ یہ ہے کہ مولانا شوکت [illegible] سے جو کام لیا ہے وہ ہر شخص کا کام نہیں ہے [illegible] اور ان کی تحریر [illegible] غور کے لائق ہے [illegible] انگریزی کے تعلیم یافتہ کہتے ہیں ایشیائی شاعری کی نسبت بعض مطاعن پیش کرتے ہیں دراصل انھوں نے دونوں زبانوں کے مذاق اور ان کے اسباب و علل اور ہر ایک کے معانی و بیانی میں غور و خوض نہیں کیا۔ اور یہ نہایت قابل افسوس ہے اسلئے میں بعض مشہور مطاعن کا جواب دیتا ہوں۔

طعنہ

ایشیائی شاعری (اُردو) کے موضوعات کلام میں مفروضات سے کام لیا جاتا ہے ایک شاعر فرضی عاشق بن جاتا ہے اور اپنے خاطر خواہ کسی کو فرضی معشوق بنا لیتا ہے

جواب

ایشیا کے طریق معاشرت اور مذاہب نے شاعری کو حد سے زیادہ آزاد ہونے کا موقع نہیں دیا۔ بلکہ اس کو ایک سٹینڈرڈ کا پابند رکھا ہے۔ اس لئے فرضی عاشق اور فرضی معشوق قرار دیئے گئے اور عشقبازی کو پسند نہیں کیا گیا جب تک کہ لیلےٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ نل دمن۔ وامق و عذرا جیسے ہیر و علانیہ طور پر مبتلائے عشق نظر نہیں آئے جن پر کسی طرح پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اور ان کے عشق کی سچائیوں نے جذبات شہوانیہ کے شرمناک اثر سے ان کو ہر طرح کے عیب سے بری ہونے کا سارٹیفکٹ دیدیا تھا۔ ہمارے یہاں ایک عورت اپنے خاوند کا اور خاوند بی بی کا نام نہیں لیتے اسی طرح عاشق و معشوق بھی کھلے ناموں کو پسند نہیں کرتے

اور ایک دوسرے کو اشارات اخفائی سے یاد کرتے ہیں جیسے وہ آتے تھے اُنکی خبر نہیں ملی۔ ایشیائی مذاق کا یا نتیجہ داں دان ہوتا ہے کہ اس کا مخاطب صحیح کون ہے اور یہ مذاق ہمارے نزدیک بجائے خود نہایت پاکیزہ ہے۔

دیگر

ایشیائی شاعری میں بار بار گل و بلبل - بہار و خزاں شمع و پروانہ۔

جواب

جس ملک میں جو شاعر قدرت اعلےٰ درجہ کے ہوتے ہیں اور اُس ملک کا مذاق اُنکو منتخب کرلیتا ہے وہی شاعری کے اجزا قرار پاتے ہیں۔ ایک کو دوسرے کے مذاق پر نکتہ چینی کرنے کا حق نہیں۔ دیکھیے انگلش مذاق زلف جاناں کے بھورے بالوں اور چشم یار کی نیلی پتلیوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن ہمارے مذاق میں وہ خوش آیند نہیں۔ چینی طبائع کو چشم محبوب کی تشبیہ ایک گول آنکھ کی مچھلی سے دینا پسند ہے مگر اردو مذاق اُس لمبا نہ اور مچھلا نہ اوصاف گول گول آنکھ کی ترکیب کو چشم جاناں کی نسبت تصور کرنے کا روادار نہیں۔ عرب کے لئے عرب کی اونٹنی کیسی عجیب معشوقہ ہے لیکن اگر ہمارے مخدوم مکرم مولینا شبلی صاحب نعمانی سابق پروفیسر عربی مدرسۃ العلوم علی گڈہ حال ناظم دینیات حیدرآباد و سکرٹری اصلاح و ترقی اردو اُس عربی اونٹنی کو جناب فصیح الملک نواب میرزا خان صاحب داغ استاد اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ یا مولانا حالی مدظلہ العالی کے دروازہ پر چھوڑ آئیں تو اُن کو اُردو کی تکمیل سے یا ندھنا مشکل ہوگا۔ اور وہ ہندوستان کے ہرن کے بدلے عرب کی اونٹنی کا لینا پسند نہ فرمائیں گے۔

دیگر علےٰ ہذا القیاس۔ اب رہی یہ بات کہ گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی خصوصیت کیوں ہے اُس کی صورت یہ ہے کہ ایشیا میں حیا و ادب کو مذہب اور معاشرت میں دخل عظیم رہا ہے۔ اس لئے اُس نے ناموں کا لکھنا اصولاً پسند نہیں کیا اور یہ دونوں

چیزیں ایسی ہیں جو عام طور سے دیکھی اور دکھائی جا سکتی ہیں۔ اور تعلم کے لئے عشق و حسن کے جذبات اور ہر طرح کی تعلیم کا آسان ذریعہ بن سکتی ہیں۔ جس سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

طعنہ

ایشیائی شاعری نے جھوٹے قصے تراشے اور دور از کار باتیں بنائی ہیں۔ کوئی دیو دیری کا افسانہ کہہ رہا ہے۔ کسی نے دیو کی تعریف کی تو ایسی کہ اس کا سر مشرق میں ہے اور پاؤں مغرب میں۔ اور ایک پر جنوب میں ہے تو دوسرا شمال میں۔ کسی نے لکھا ہے کہ صبح کو دریا میں غوطہ لگایا تو مرد ہو گیا۔ اور شام کو غوطہ لگایا تو عورت بن گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں باولی میں پریاں رہتی تھیں کوئی سبز پری تھی کوئی سرخ پری کہیں فلاں دیو نکلا۔ کہیں کالا دیو۔ بھلا یہ قیصے اس میں آنے کی باتیں ہیں۔ ان پر انگلش سوسائٹی کے نوجوان جو نیچرل سینریوں کے شیفتہ ہیں خندہ زن نہ ہوں تو کیا ہو۔

جواب

کس زبانِ مرا نمے فہمد
بعزیزاں چہ التماس کنم

واقعی آپ کا کہنا آپ کی سمجھ کے موافق ٹھیک ہے اور ایسا کہنا اس لئے ہے کہ آپ نے ایشیائی شاعری کے مذاق اور اس کے اصول معانی کو دریافت نہیں کر پایا۔ ورنہ ہم سے زیادہ آپ اس کے شیفتہ نظر آتے۔ اور جیسے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ایشیائی استعارات کو اپنے عربی کے دیوان سبحۃ المرجان میں خرچ کیا جس کو دیکھ کر شعرائے عرب مرحبا کہتے ہیں ویسے ہی آپ ان استعارات کو انگریزی میں لیجا کر یہ تحفہ انگلستان کی نذر کرتے

تو آپ کا خاص یادگار رہتا ۔ عزیزو یہ زمانے کی خوبی اور شاعری کی بدنصیبی ہے کہ شاعری کا اعلےٰ سے اعلےٰ مذاق یوں سطحون ہو رہا ہے ۔ کسی قوم کا جب زمانہ خراب ہوتا ہے تو اسکے تمام محاسن عیوب سے بدتر ہو جاتے ہیں ۔ اور جیسے کسی آدمی کے مرنے سے پہلے اُس کی آواز پر ایک خاص مرتی کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں ۔ اور سخن جوہر زندہ آدمی کے جینے کی پہچان ہے ۔ اُس میں ایک لازمی تغیر نظر آتا ہے ۔ یہاں تک کہ جب زبان بند ہو جاتی ہے تو اُس کے مرنے میں شبہ نہیں رہتا ۔ اگرچہ بعض سکتہ کی حالتیں کچھ دیر کے لئے اُس کی زندگی کا آسرا دیتے یا اُس کی زندگی کو قایم رکھنے والی ہوں ۔ پس اگر تم اپنی زندگی کی علامت (زبان ادب شاعری) کو قایم رکھنا چاہتے ہو تو بقائے سخن سے اپنی زندگی کا منصوبہ باندھو ورنہ اپنی ایشیائی زندگی سے ہاتھ دھوو اور دوسرے جسم میں جنم کے لئے راضی ہو ۔

دوستو! میں نے ایک رسالہ ایشیائی شاعری کے مذاق خاص اور اس کے اصول کی فلاسفی پر لکھا ہے ۔ اُس میں تفصیلاً ایسے خیالات کا ذکر کیا ہے اور یہاں اجمالاً اُن کو نقل کرتا ہوا واضح ہو کہ ایشیائی شاعری نے جھوٹے قصّے نہیں تراشے ۔ ہماری شاعری کے اصول میں جھوٹ بولنا بدترین گناہ سمجھا گیا ہے ۔ اور جھوٹ نہ بولنے کے لئے دوسری تدبیریں اختیار کی ہیں ۔ جسکو میں آگے چلکر بیان کروں گا ۔ ہم فرضی قصّے ضرور بناتے ہیں اور دور از کار باتیں جان بوجھ کر بنائی ہیں ۔ جیسے فرانس کے شاہنشاہ نپولین نے فرنچ ڈکشنری سے ناممکن کا لفظ نکلوا دیا تھا تاکہ بڑے سے بڑا خیال ناممکن نہ سمجھا جائے اور وہ دور از کار باتیں اس لئے بنائی ہیں کہ اُن کے سمجھنے میں دماغ پر زور پڑے ۔ اور اُس سے عقل کی روشنی ترقی کرے ۔ اور اُن کے پڑھنے میں وہ لطف اور دلچسپی حاصل ہو جو لوں کو لازمی طور سے اُسطرف متوجہ رکھے ۔ میں اُن میں الف لیلہ بوستان خیال کے نام خاص طور سے لے سکتا ہوں ۔ اور دیو پری کے افسانے بہت صحیح لکھے گئے ہیں ۔ اور وہ سب استعارات ہیں ۔ اور جو بات خود مفروضات کہہ کر پیش کی گئی ہو اُس کو واقعہ سمجھنا بجائے خود عقل کا قصور ہے ۔

جناب والا - وہ دیو آفتاب ہے جس کا سر مشرق اور پاؤں مغرب میں ہیں اور ایک ہاتھ
جنوب میں اور دوسرا شمال میں ہے - اور جب صبح کو غوطہ لگایا تو مذکر کی علامت پائی
یعنے دن ہوا - اور جب شام کو غوطہ لگایا تو مؤنث کی علامت پائی یعنے رات ہوئی اور
پریوں سے مراد ہر قسم کے جانوران خوش رنگ و خوش مذاق سے ہے - دن کا استعارہ
لال دیو سے اور رات کا سیاہ دیو سے کیا گیا ہے - چنانچہ میں نے اس مذاق کے متعلق شہد
کی مکھی اور شمع و پروانہ کی نسبت دو نظمیں لکھی ہیں - سرسری طور سے پڑھنے میں ایک دور
از کار افسانہ اور بناوٹی ہوئی بات معلوم ہوتی ہیں - لیکن آخر میں اصلی راز کو بتا دیا
گیا ہے - اور جب اسکے موافق ہر استعارہ کی مطابقت کی جائے تو ایک خاص دلچسپی
حاصل ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے ذہن کو معنی فہمی کیجانب خاص دلچسپی سے
مائل کرنا اسکا لازمی اثر ہے - ایسے ہی ہمارے مخدوم اور مشہور فاضل جناب شمس العلماء
مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی فیلو یونیورسٹی الہ آباد نے حکیمانہ اور عالمانہ تصنیفات
تیار فرما کر اُنکے ماسوا مصنفوں میں سب سے زیادہ اردو کے لئے علمی سرمایہ
جمع کیا ہے - ایک علمی اندر سبھا طبیعات کا پرستان بنایا ہے جس میں آفتاب
کو اندر اور اسکی شعاعوں کو پریاں بنا کر ان کے وہ عجیب و غریب اور حیرت انگیز
افعال دکھائے ہیں - جس سے بے اختیار دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور کتاب کو تمام کئے
بغیر دل نہیں مانتا - یہ کتاب نئے گریجوایٹوں پر ایشیائی مذاق کا قابل قدر اثر ڈالنے میں
اپنی وضع کی پہلی کتاب ہے - جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی
کے طرز بیان میں بھی لطیف استعارات کی رنگینی خاص قبولیت اور عام دلچسپی رکھتی
ہے - اگر اُن کے بیان سے اس مذاق کا حصہ نکال لیا جائے تو کبھی یہ وصف باقی
نہیں رہ سکتا - دیکھو اسی سال ۱۹۰۳ء کے جلسہ لاہور میں لیکچر انسان کے خلیفۃ اللہ
ہونے پر دیا ہے - اس کے استعارات نے ایک تیرہ سو برس کے خشک مضمون کو
کیسا دلچسپ بنا دیا ہے - جو اُردو کا لائق "بادت" قرآن بن رہا ہے - سر سید احمد خان
نے استعارات کی دلچسپ موشگافیوں سے اپنے کلام میں جو حسن قبول پیدا کیا - وہ انکا

اور انگلی ادب فہمی کا حصہ مانا جاتا ہے۔ اگرچہ ترقی مذاق شاعری کی حد سے باہر علمائے
کبار کے حد ادب میں تماشا [illegible] ہو جاتے۔

عزیز ہے اور اُٹھے [illegible] ایسی نہیں جن سے سننے والے کی
صورتیں نظر آئیں۔ یہ کام [illegible] سکتی ہے کہ ہم اپنے ایشیائی
دفینہ کو معلوم کریں اور اُس ذخیرہ پر [illegible] ڈالو اور ایک ایک بات کے معانی و
مبانی پر غور کر کے ایک مفید اور قابل قدر [illegible] دکھاؤ اور ہر خیال اور ہر مذاق کے
اسباب و علل دریافت کریں کہ اُن پر جدید [illegible] کا خاتمہ ہو تاکہ اخبارات
اور مطابع کو بھی اُس رہنمائی سے کتابوں پر ریویو کرنے اور تقریظیں لکھنے کی راہ
نکلے اور وہ جواہرات جو سینکڑوں برس مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ وہ جلائے
تازہ حاصل کریں اور مغربی دنیا کو ایشیا کے نہایت دلچسپ [illegible] اور ایشیائی
سوسائٹی کے قابل قدر مذاق سے آگاہ کرنے والے ہوں۔

اُردو شاعری اور انگلستان

ہم نے اس کتاب میں اپنی اپنی جگہ پر عربی۔ فارسی۔ سنسکرت کی کتابوں کا
برٹش میوزیم اور اکسفورڈ اور کیمبرج کے کتب خانوں میں پتا بتایا ہے۔ اُسکو دیکھ کر
آپ خیال کرینگے کہ کیا وہاں کے کتب خانوں میں ہماری اردو کا بھی پتا ہے یا نہیں
میں کہتا ہوں کہ ہے لیکن بہت شرمناک اور افسوسناک۔ اُسکی صورت یہ ہے
کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں میرزا رفیع السودا۔ اور نظیر اکبر آبادی کے دیوان بھیجے
گئے ہیں۔ اور ظفر شاہ خاتم سلاطین مغلیہ دہلی اور واجد علی شاہ خاتم تاجداران
لکھنؤ کے دیوان بھی ارسال ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ حیدرآباد کی بی چندا کا بھی
ایک دیوان صاحب رزیڈنٹ کی معرفت ارسال ہوا ہے۔ مگر ان سب کی شاعری میں کوئی
ایسی کوئی بات ایسی ہے جو مغربی مذاق میں پسند ہو۔ مٹنے کے لائق نہیں اور وہ [illegible]
مشرقی سوسائٹی کی محرمیت پر دیکھی جا سکتی ہے۔ یا بعض اشعار کم سے کم شاعری

سکی قدر و قیمت کا [illegible] کے لائق نہیں۔ اور مجھے توقع ہے کی بات سے کہ انگریز
[illegible] ہندوستانی [illegible] سے دلچسپی رکھتے ہیں [illegible] نگاہ رکھتے ہیں
وہاں تشریف [illegible] مختلف شہروں سے تشریف لے جاتے ہیں۔ لیکن اب تک
[illegible] کیمبرج میں اردو [illegible] کا کوئی قابل قدر انتظام نہیں ہوا [illegible]
[illegible] خاص ضرورت اس کی ہے کہ وہ اردو کی ترجمہ
[illegible] شدہ ہر قسم کی پسندیدہ اور قابل قدر کتابوں اور شاعری
[illegible] ادبی نشانات کا ایک ذخیرہ فراہم کرکے اور نہایت عمدہ
[illegible] ذخیرہ سے ترتیب دے کر ایک ایک صندوق آکسفورڈ اور کیمبرج کو روانہ کیجے
اور اگر [illegible] خاص [illegible] خاص طبائع اپنی ذاتی فیاضی اور کوشش سے
[illegible] اپنی زبان کا ایک حق ادا کرنے والے ہوں گے۔

حسن بیان

جیسے زبان بشر کا معجزہ ہے۔ ویسے ہی حسن بیان آدمی کا چلتا ہوا جادو ہے
مسلمانوں کی آسمانی کتاب جسکی فصاحتوں اور بلاغتوں کو لاثانی تسلیم کیا گیا ہے اُس کے
پڑھنے کو بھی قرأت اور الحان کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور جسکو یہ بات حاصل نہیں اُسکو
پسند نہیں کیا جاتا ؎

گر تو قرآں بدیں نمط خوانی
ببری رونق مسلمانی

موسیقی کا جاننے والا کیسا ہی صاحب کمال ہو لیکن وہ اچھی آواز اور موسیقی کے
نغموں اور رمزوں کو خوش ادائی سے ادا کرنے کی لیاقت نہیں رکھتا تو سننے والے
کو اُسکے حرام ہونے میں دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یورپ میں پرنس بسمارک اور
گلیڈسٹون کی اسپیچوں کو اُن کا حسن بیان خاص طور سے چمکا دیتا تھا۔ شمس العلماء
مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی کی تقریر میں حسن بیان کا حصہ سامعین کو خاص طور سے

اُنکی تقریر سُننے کا مشتاق بنائے رکھتا ہے۔ میر انیس اور میر نفیس اور مرزا دبیر اور مرزا اوج کے سُننے کو ہزاروں آدمی اُن کے شیفتہ پائے گئے۔ خوش بیان خطیب اور واعظ کے وعظ و خطبہ سُننے کی نسبت خاص ہیجان ظاہر کیا جاتا ہے۔ ویسے ہی شاعر کو حسن بیان کی خاص ضرورت ہے جو اُس کے کلام کو خاص دلچسپی سے سُنا جائے اور اسی واسطے موسیقی کو شاعری کی سواری بنایا گیا ہے اور آپ تھوڑے غور میں تمیز کر سکتے ہیں کہ آپ نے جو اشعار کسی خوش بیان کی زبان سے سُنے یا کوئی غزل کسی خوش آواز گانے والے کے ذریعہ سے آپ کے کانوں میں پڑ گئی۔ اُس کا لطف مسرت حاصل ہوا ہوگا۔

مشرق اور مغرب

جب خدا کسی قوم کو اقبالمند کرتا ہے تو وہ اپنی برائیوں کے چھوڑنے اور دوسروں کی بھلائیوں کے اقتباس میں کوشش کرتی ہے ؎

شارع نیک مردماں کہ باشد

اور جب کوئی قوم ادبار میں مبتلا ہوتی ہے تو وہ دوسروں کی برائیاں قبول کرتی ہے اور اُسکو اپنی بھلائیوں کا احساس نہیں ہوتا۔ اور اس سے اچھے بُرے میں غور و خوض کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہم کو اپنے اور اقبالمندان مغرب کی بات بات سے ملتا ہے۔ اور ہر باب میں وہ فائدہ کی طرف اور ہم نقصان کی سمت جاتے معلوم ہوتے ہیں۔

اسی طرح جب کوئی قوم شاہانہ اولعزمی کے ساتھ ترقی کرنا شروع کرتی ہے تو وہ آگے چلکر اُس شاہانہ ترقیات کے مزے اُٹھانا چاہتی ہے۔ بڑے بڑے باغ لگائے جاتے ہیں۔ اور اُس میں طرح طرح کے خوشنما پھول چھوڑے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محل بنائے جاتے ہیں۔ اور اُن کو ہر طرح کے فرنیچر سے آراستہ کیا جاتا ہے اور طرح طرح کے علماء اور فضلا اور حکیم و ندیم ان محلوں سے دربار و مجالس کا سرمایہ

فخر و ناز بنتے ہیں - اور شاہی دربار کی دلچسپی اور رونق کے سامان ہونا شروع ہوتے ہیں - ان میں موسیقی اور شاعری کو خاص دخل ہے - کوئی قوم ایسی نہ پائی جائے گی جس نے ترقی کی حالت میں موسیقی اور شاعری کو اپنا جلیس و ہمدم نہ بنایا ہو - خصوصاً ایشیا نے ہزاروں برس اس شغل میں وہ اعلےٰ مذاق پیدا کیا ہے - جسکے بگڑے ہوئے نشان اب بھی تمام دنیا کی موسیقی اور شاعری سے بلند تر پائے جاتے ہیں - پھر جب اس قوم کا اقبال گرنا شروع ہوتا ہے تو جیسے ایک آدمی کے مرنے سے پہلے اس کی زبان کا بند ہونا لازمی پایا جاتا ہے - ویسے ہی قوم کے مرنے سے پہلے اس کی زبان اور اس کا ادب بھی پست ہونا شروع ہوتا ہے - اور اس کے مذاق کا ٹمپریچر اعلےٰ سے اسفل کی جانب اترنا قبول کرتا ہے - اور ابتداء میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اعلےٰ درجہ کے گذشتہ لوگوں کی تقلید کرتے اور نقل اتارتے یا ان کے خیال و مقال میں کمی اور بیشی کر کے کام نکالتے ہیں جسکو ایک زندہ آدمی کا مردہ جسم کہہ سکتے ہیں - پھر تیسرا دور اس مردہ جسم کی تصویر اتارتا ہے جس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر فلاں شخص کی ہے - لیکن اس سے اسکے اوصاف کمال کی امید نہیں کی جا سکتی - یہی حال ہماری ایشیائی شاعری کا ہے - اور جو ہماری قوم کے انگلش تعلیم یافتہ یا ہندوستان کی دوسری قوموں کے گریجوایٹ خیال کرتے ہیں کہ مغربی لٹریچر کی سینریاں اور اس کا طرز ادا انکا حصہ ہے اور وہ گھر سے نکل کر ایک پھول کے درخت پر شام کو چڑیوں کا چہکنا پھولوں کا مہکنا پتوں کا ہلنا وہ سمندر کی لہروں کا اچھلنا نظم میں دیکھ کر فرماتے ہیں - یہ صرف مقال کی دلچسپی ہے - جیسے موسیقی میں دادرہ خواہ مخواہ اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اسکو ٹپہ خیال دھرپد جیسے اعلےٰ موسیقی سے واسطہ نہیں - وہی حال مغربی مقالات کی دلچسپی اور مشرقی خیالات کی گہرائی کا ہے -

اور ہمارا موجودہ زمانہ بجز اس کے کہ جنگل پہاڑ دریا سمندر دھوپ - چاندنی اور نیچر کی عام چیزوں سے دلچسپی حاصل کرے اسکو وہ مقامات کہاں نصیب جو کسی قوم

کوششیں نہ ہزاروں برس کی ترقی کرنے کے بعد نصیب ہوئی ہیں۔ اور یہاں ان کو ایشیا کے مذاق و ذوق سے تعلق رہا ہے۔

مثلاً ایک بادشاہی دربار کے لئے اتنے آداب مقرر ہیں۔ جو ایک بڑی کتاب میں سما سکتے ہیں۔ اور ہر مقام کے مناسب حال القاب اور آداب اور الفاظ کا لانا ضروری ہے۔ لیکن ایران نے سب سے ترک تعلق کر کے ایک حضرت سلامت۔ پیاسے دوست۔ مائی ڈیر کو سرمایہ ادب فرض کر لیا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس طرح اچھی طرح جانتا ہے۔ جو صرف ادب کے نہ جاننے کی وجہ سے ہے اور اس کا نہ جاننا رس۔ لیتا ہے کہ ضرورت نہیں۔

شاعری کی اجمالی کیفیت

(۱) جب ہم باغ میں جاتے ہیں تو آبجو کی روانی۔ سرو و شمشاد کی خوش قامتی بلبل کی نغمہ سرائی۔ کوئل کی کوکو۔ فاختہ کی حق سرہ۔ گل و لالہ کے تختے۔ چنبیلی اور بیلے کے پھول۔ نسیم سحری کے ہلکے ہلکے جھونکے مجموعی طور سے ہمارے دل پر ایسا اثر کرتے ہیں کہ کوئی باطنی قوت جوش میں آتی ہے اور پھر ایک نئی حالت طاری ہو جاتی ہے جب ہم سمندر کے کنارے پر کھڑے ہوتے ہیں تو پانی کی لہروں کا تموج اور دریائی جانوروں کا تیرنا جہازوں اور کشتیوں کا ادھر ادھر چلنا پھرنا دل پر ایک فوری اثر پیدا کر دیتا ہے جب ہم کسی گاؤں میں جاتے ہیں تو سبز سبز کھیت باغ۔ تالاب۔ میدان جنگل اور پہاڑ کی چوٹیوں کا نظارہ ایک جدید اور محسوس ہونے والا اثر پیدا کر دیتا ہے یہ قوت روحانی ہر موقع پر قدرتی نظاروں کا اثر محسوس کرنے کے بعد ایک قسم کا جوش پیدا کرتی ہے اور بے ساختگی کے ساتھ زبان سے کچھ نہ کچھ الفاظ نکلوا دیتی ہے۔ جو اثر میں ڈوبے ہوئے اور تاثیر سے لبریز ہوتے ہیں۔

(۲) اسی طرح بزم رزم۔ خلوت۔ جلوت۔ رفتار گفتار کا فوٹو لینا شاعری کا کام ہے۔ جو اس ملک یا قوم کے مذاق کے حسب حال تیار ہوتا ہے۔

(۳) ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص یک چشم (کانا) ہوتا ہے اُسکی صورت دیکھنے سے ہمارا نظارہ خوش نہیں ہوتا۔ جس مکان کے دروازہ پر چوکھٹ کے ایک جانب طاق ہو اور دوسری جانب نہو تو اُس کا معائنہ خوشگوار نہیں ہوتا۔ ہم اپنے کمرہ کا دروازہ بناتے ہیں تو دروازہ کی ڈاٹ کے دونوں قوس ٹھیک مساوی رکھتے ہیں اگر بال برابر کا فرق ہو جائے تو کمرہ خراب معلوم ہوتا ہے۔ دُور کیوں جاتے ہو آدمی ہی کو دیکھو کہ سر سے کر پیر تک دونوں جانب ایک عضو کا جواب دوسرا عضو ہے اس تقریر سے معلوم ہوا کہ انسان کی روح میں ایک قوت ہے جو موزونیت اور لطافت خواہ برابر کی دو چیزوں یا ایک چیز کے دو حصوں کی مساوات اور باقاعدگی کو پسند کرتی ہے اور اسی کو نظم پسندی کی قوت سمجھنا چاہیئے۔

(۴) ہم دنیا میں دو ہی قسم کی چیزیں دیکھتے ہیں ایک قدرتی جیسے درخت پہاڑ دریا بادل ستارے۔ انسان۔ حیوان وغیرہ دوسرے وُہ چیزیں جن میں انسانی صنعت کو دخل ہے جیسے مکان۔ صندوق۔ قلمدان۔ ٹوپی۔ لیمپ۔ قالین وغیرہ اور اِن دونوں کے دیکھنے سے ہماری جو قوت مناسبت اور موزونیت کا اندازہ کرتی ہے اسی کو ہم شاعری کے نام سے موسوم کرنا چاہتے ہیں۔

(۵) شاعری کا درجہ نظم سے بالا تر ہے۔ نظم ایک معمولی بات ہے اور شاعری حکیمانہ غور کا نتیجہ اور نکتۂ حکمت۔

(۶) شاعر کے حواس ظاہری اور باطنی عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ کیفیات اور تاثرات کے ادراک کی قوت بڑھی ہوتی ہے۔ شاعر چیزوں کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عوام ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر چیزوں کے اصلی حسن و جمال پر جس طرح نظر کرتا ہے عوام ہرگز نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک نقاش اور فوٹوگرافر کسی مکان کے نقشہ اور کسی صورت کی تصویر میں جو باریک لطائف دریافت کر سکتے۔ اور اُن کو بے ساختگی سے اُن کے اچھے بُرے کی تمیز ہوتی ہے دوسروں کو نہیں ہو سکتی۔ سادہ کار کی مثال ناظم کی ہے جو چاندی کے پتر پہ نہایت نفیس نقش ...

کرتا اور ایک چیز کو نہایت سادگی اور صفائی سے بناتا ہے اور شاعر کی مثال اعلےٰ درجہ کے جڑیئے سے دیجا سکتی ہے جو سونے کا زیور بنانے کو اُن کے مقصود سے بناتا گھاٹ درست کرتا اور ایک ایک نگینہ کو مناسب مقام جڑتا ہے جس کا مال سادہ کار کے مال سے زیادہ قیمتی اور اُس کا کام سادہ کار کے کام سے زیادہ قابل قدر ہے۔ دوسری مثال نظم اور شاعری کی موٹی موتیوں اور سچے موتیوں سے دیجا سکتی ہے۔ موٹی موتی معمولی تمیز سے ایک دوسرے میں پروئے جا سکتے ہیں لیکن سچے موتیوں کو قرینہ سے درجہ بدرجہ بٹھانا اور اُن کو سلک مسلسل میں پرونے کا کام خاص جوہری کا ہے جو معمولی نگاہ اور معمولی سلیقہ سے سرانجام نہیں پا سکتا۔

(۷) جیسے کسی بُری اور بدشکل تصویر کا اثر مصور ہی پر نہیں پڑ سکتا بلکہ مصور کا بھونڈا پن کہا جا سکتا۔ یا خود اُس صورت کی کراہت سے علاقہ رکھتا ہے۔ ویسے ہی اگر آج کل ہم سے اچھے شعر نہیں کہے جاتے یا اچھے شعر کہنے کے مناسب حال سامان ہم کو میسر نہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ شاعری ہم کو شرمندہ اور گنہگار کر رہی ہے۔ بلکہ اس کے معنی یوں کہنا چاہئے کہ ہم شاعری کو شرمندہ اور گنہگار کر رہے ہیں۔

شاعری کو مذاق سلیم کی ضرورت

جیسے حسن کے دیکھنے کو اچھی آنکھوں کی ضرورت ہے ویسے ہی شاعری کو مذاق سلیم کی ضرورت ہے۔ جیسے ایک اندھا آئینہ اچھی صورت کو نہیں دکھا سکتا ویسے ہی ایک بھد اُمذاق شاعری کی لطافتوں اور اُسکے حسن معانی کو نہیں دریافت کر سکتا۔ دلّی اور لکھنؤ کی تاج محل یا خاقان بیگم اور امریکہ اور پیرس کے شاہی خاندان کی لیڈی جو اپنی ہجولیوں کے ساتھ مصروف خرام ہوں تو اُن کے شکوہ و تبختر و اور ادا و نسب کے لطائف حسن کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ موسیقی کے اعلےٰ مقامات ہر نغمہ خوان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اور نہ اُس کی بے شعوری اور بے علمی

اسکو ان لذتوں سے متلذذ کرسکتی ہے۔

مذاق سلیم کی تعریف یہ ہوسکتی ہے، کہ وہ قدرت اور صنعت کے محاسن سے خوشی حاصل کرنے کا ایک خاص ذریعہ یا خاص قوت ہے۔ جس کو ادراک بھی کہتے ہیں لیکن مذاق سلیم اور ادراک میں ایک نازک امتیاز ہے جسکی نسبت انگلش لٹریچر میں موشگافیاں کی گئی ہیں۔ جیسے طبیعت محض ایک شے کے سمجھنے یا نتیجہ نکالنے سے ایک خوبصورت منظر دیکھکر یا ایک عمدہ نظم پڑھکر خوش نہیں ہوسکتی۔ ایسی چیزیں بسا اوقات اپنے آپ ہمارے دل پر اثر کرتی ہیں اور اس حالت میں کرتی ہیں جب ہم اپنی خوشی کی کوئی وجہ نہیں بیان کرسکتے بعض اوقات وہ ایک فلسفی اور ایک کسان ایک بچے اور ایک جوان پر یکساں اثر کرتی ہیں۔ پس جس قوت سے ہم ان محاسن کا لطف اٹھاتے ہیں وہ ادراک کی بہ نسبت حس باطنی سے زیادہ متعلق معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اس نے ایک خارجی حس سے اپنا نام مستعار لیا ہے۔ جس قوت سے ہم طعام کی لذتیں حاصل کرتے ہیں اس نے مختلف زبانوں میں لفظ مذاق (ذائقہ) کو اس مجازی معنی میں پیدا کردیا ہے جیسا اب ہم غور کررہے ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ ادراک مساعی کے مذاق سے بالکل خارج ہے۔

جس اصطلاح میں ہم نے مذاق کو بیان کیا ہے اس میں مذاق ایک ایسی قوت ہے جو ایک گونہ کل آدمیوں میں مشترک ہے۔

انسانی سرشت میں حسن کی لذت ہے ہر ایک واقف ہے حسن کی بھی کوئی قید نہیں کسی قسم کا ہو۔ جو شے باقاعدہ متعدل متناسب عظیم الشان خوش اسلوب نئی یا رنگین ہوگی اس کے دیکھنے سے دل کو ضرور مسرت ہوگی۔ جوان نوجوان چھوٹے بچوں تک میں نہایت ہی کم عمری میں مذاق کے اصول کی ہر روز صورتیں نمایاں ہوتی ہیں وہ خوبصورت اشیاء سے رغبت کرتے ہیں۔ تصویروں اور کھلونوں کو پسند کرتے ہیں۔ ہر قسم کی نقلی اور نئی اور نادر چیزوں سے ان کو بے انتہا الفت ہوتی ہے گنوار سے گنوار آدمیوں کو قصہ کہانیوں سے دل آویزی ہوتی ہے اور وہ زمین و آسمان

کے قدرتی مناظر دیکھکر متاثر ہوتے ہیں ۔حتیٰ کہ جنگل کے وحشیوں میں جہاں انسان نہایت ہی غیر تربیت یافتہ حالت میں رہتا ہے زیور اور کپڑے کا رواج ہے ۔جنگ اور موت کے گانے گائے جاتے ہیں ۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مذاق سلیم کے اصول کی گہری بنیاد انسان کے دل میں ہے ۔

ہر چند کوئی شخص اس قوت سے قطعی مبرا نہیں ہے لیکن وہ جس درجہ مختلف لوگوں میں پائی جاتی ہے بالکل جداگانہ ہے ۔بعض لوگوں میں مذاق سلیم کی صرف ایک ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے ۔جس قسم کے محاسن کو وہ پسند کرتے ہیں وہ نہایت ہی بھدی قسم کے ہوتے ہیں اور ان محاسن کا اُن کو ایک کمزور اور پریشان خیال رہتا ہے ۔ اور بعض لوگوں میں مذاق سلیم اعلےٰ درجہ کا ہوتا ہے ۔اور وہ نہایت نفیس قسم کی خوبیوں کا چٹخارا عجیب لطف کے ساتھ لیتے ہیں ۔ بادی النظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں مذاق سلیم کی قوتوں اور مسرتوں میں حس مشترک ادراک اور رائے کے لحاظ سے ایک نمایاں عدم مساوات پائی جاتی ہے لیکن یہ عدم مساوات کسی قدر اسکی طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ہے اسکا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض آدمیوں کے اعضاء اور باطنی قوتیں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ لطیف اور نازک ہوتے ہیں ۔ اور ایک حد تک تعلیم و تربیت کو بھی اس میں دخل ہے اس کی تصدیق مزید اس افضلیت سے بھی ہو سکتی ہے جو ایک ہی قوم میں اُن لوگوں کو جنہوں نے فنون لطیفہ سیکھے ہیں ان لوگوں پر ہے جو غیر تعلیم یافتہ اور جاہل ہیں ۔

اب میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا کہ کن ذرائع سے مذاق کی تحصیل و ترقی میں اسقدر نمایاں فرق ہو جاتا ہے ۔ سب سے پہلے قدرت کے اس بڑے قانون پر غور کیجئے کہ مشق و مزاولت ہماری کل قوتوں کی اصلاح و ترقی کا خاص ذریعہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کا پیشہ یا کاروبار اُن سے قوائے مدرکہ کی باریک مشق و مہارت کراتا ہے اُن کے احساس نہایت تیز ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً پالش کرنے والوں کی قوت لامسہ اور لوگوں کی بہ نسبت نہایت لطیف ہو جاتی ہے ۔

جن لوگوں کو آلات خوردبین سے سروکار رہتا ہے یا جواہرات کا کام کرتے
رہتے ہیں وہ باریک سے باریک چیزیں عجیب و غریب صحت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں جو
لوگ مختلف قسم کے عطر یا اشربہ کی تقطیر کے کاموں پر مقرر ہیں اُن کی قوت
شامہ نہایت تیز ہو جاتی ہے اور وہ مرکبات کو محض خوشبو سے پہچان
سکتے ہیں اگر مذاق سلیم کو ایک ایسی ہی ساوحی قوت فرض کر لیا جائے تو وہ
متواتر مشق اور کامل توجہ سے بڑھ سکتی ہے اس کا بدیہی ثبوت مذاق سلیم کے
اُس حصہ سے ملتا ہے جو موسیقی سے متعلق ہے۔ تجربہ سے روز بروز یہ بات ہویدا
ہوتی جاتی ہے کہ اُس سے زیادہ کوئی چیز ترقی پذیر نہیں ہے۔ شروع شروع میں معمولی
سے معمولی اور سادے سے سادے راگ پسند کئے جاتے ہیں پھر مشق و مہارت
ہمارے انشراح کے احاطے کو وسیع کر دیتی ہے اور رفتہ رفتہ نہایت مشکل مقامات
کے لطائف سے آگاہ کرتی ہے۔ اور انسان کی آوازوں کے علاوہ مختلف سازوں
میں نغمہ اور زمزمہ کی باریکیوں کو جاننے اور جو تاثر اُن سے پیدا ہوتی ہے جس کو معمولی
مذاق نہیں جانتا اُسکو پہچاننے لگتے ہیں اسی طرح آنکھ نقاشی اور مصوری کے محاسن
یکبارگی نہیں معلوم کر سکتی بلکہ آنکھ میں یہ قدرت تصویروں سے واقفیت پیدا ہوتے
ہوتے اور جا بکدست مصوروں کے نمونے دیکھتے دیکھتے پیدا ہو جاتی ہے۔ علیٰ ہذا
حسن تحریر اور حسن تقریر کے لحاظ سے انشا پردازی کے اعلےٰ نمونوں اور مقبول نظیروں
پر توجہ رکھنے اساتذہ کا کلام پڑھنے اور ایک ہی قسم کے محاسن میں اعلےٰ اور ادنےٰ
درجات کا مقابلہ کرنے سے مذاق کی اصلاح ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص شروع شروع
میں کسی اُستاد کے کلام سے شناسا ہوتا ہے تو ابتدا میں اس کا مذاق پریشان
اور دھندلا ہوتا ہے وہ اُس شئے کے مختلف محاسن و معائب بیان نہیں کر سکتا۔ وہ
حیران رہتا ہے کہ میں کس بنیاد پر اپنی رائے قائم کروں گا۔ اس سے فقط اتنی ہی توقع
ہو سکتی ہے کہ وہ بادی النظر میں اپنی خوشی اور ناخوشی کا اظہار کر دے لیکن جوں جوں اس قسم
کے کاموں میں اس کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے اس کا مذاق رفتہ رفتہ زیادہ سلیم اور روشن ہوتا

جاتا ہے وہ صرف کلام کی نوعیت سے پہچاننے نہیں لگتا بلکہ ہر حصہ کے حسن و قبح اسکو معلوم ہو جاتے ہیں اور اس میں اسقدر ملکہ ہو جاتا ہے کہ جن چیزوں کو اس سلئے اچھا یا برا کہا ہے انکی مخصوص صورت بیان کر سکے۔ ہر چند مذاق سلیم ایک حس ہی پر مبنی کیوں نہو لیکن اسکو بہت وسیع معنی میں دیکھنا چاہیئے۔

اس سے مطمئن ہونے کے لئے ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اساتذہ سلف کی تصانیف کا بیشتر حصہ صرف قدرت کی نقل اور انسان کی سیرت اعمال اور اطوار کا خاکہ ہے۔

جو مسرت ان حالات اور بیانات سے حاصل ہوتی ہے وہ محض مذاق سلیم پر مبنی ہے لیکن یہ امتیاز کرنا کہ وہ ٹھیک طور سے نمایاں کئے گئے ہیں یا نہیں ادراک کا کام ہے جو اصل کو نقل سے مقابلہ کرتا ہے۔

مثلاً شاہنامہ پڑھتے وقت ہماری فرحت کا زیادہ تر سبب کلام کی بندش قصہ کا تسلسل اور بیان کی سلاست ہے ایسی نظم سے جو امنگ پیدا ہوتی ہے وہ حس باطنی کے طور پر مذاق سلیم کے ذریعہ سے محسوس اور حاصل ہوتی ہے لیکن نظم میں ان صفات کا انکشاف ادراک کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور جسقدر یہ ادراک نظم کی مناسبت اور موزونیت ظاہر کرتا ہے اسیقدر ہم اس سے محظوظ اور مسرور ہوتے ہیں انھیں دو وسائل یعنے حسن مذاق کی متواتر مشق اور ادراک اور عقل سلیم کے باقاعدہ عمل سے مذاق بطور ایک قوت طبعی کے ترقی کرتا ہے اور وہ اپنی مکمل حالت میں دراصل فطرت اور ہنر دونوں کا مجموعی نتیجہ ہے۔

ہم کو اس بیان میں اسقدر اور اضافہ کرنا ہے کہ اخلاقی نیکیاں مذاق سلیم پر ایک قریب یا بعید اثر ڈالتی ہیں۔ جس شخص کا دل سخت اور خراب ہے۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ کون چیز دراصل عمدہ اور قابل تعریف ہے جسمیں نازک اور لطیف چیزوں کی ٹھیک پرکھ نہیں وہ فصاحت و بلاغت اور شعر و سخن کے اعلےٰ ترین محاسن کو نہیں سمجھ سکتا اعلےٰ مذاق کی نوعیت اپنی اکمل حالت میں دو چیزوں پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ نزاکت اور صحت۔ نزاکت مذاق خاصکر اس قدرتی حس کی تکمیل سے متعلق ہے جسپر مذاق مبنی ہے

اس سے مراد وہ لطیف تر اعضا یا قوی ہیں جن کی مدد سے ہم کو وہ محاسن نظر
پڑتے ہیں جو ایک گنوار آدمی کی نظر میں پوشیدہ ہیں۔ ایک شخص کی قوت احساس
کتنی ہی بڑھی ہوئی ہو لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ وہ مذاق لطیف میں قاصر ہو۔ وہ
ان محاسن کو دیکھکر کتنا ہی متاثر ہو لیکن اسکو صرف وہی شئے نظر آتی ہے جو کسیقدر
بھدی نمایاں یا اُبھری ہوئی ہے۔ لیکن سادہ اور نازک تر زیبائشیں اُس کی نظر سے
مخفی رہتی ہیں۔ جاہل اور غیر تربیت یافتہ قوموں میں بالعموم اسی قسم کا مذاق ہوتا ہے
لیکن نازک مذاق آدمی پر جو اثر پڑتا ہے وہ مضبوط بھی ہوتا ہے اور صحیح بھی۔ وہ
ان تفریقات و اختلاف کو دیکھتا ہے جو اوروں کو نظر نہیں آتے۔ پوشیدہ سے
پوشیدہ حسن اسکی نظر میں آجاتا ہے۔ اسکو باریک سے باریک عیب معلوم ہوجاتا ہے
لطافت مذاق کا بھی وہی معیار ہے جو ہم ایک حس خارجی کی لطافت جانچنے میں استعمال
کرتے ہیں جس طرح ایک خوش ذائقہ شے اُس کے اجزا کی آمیزش دنہ کہ تیز خوشبوؤں سے
پہچانی جاتی ہے اور باوصف اُس امتزاج کے تمام اجزا جُدا جُدا خلق کو محسوس ہوتے ہیں
اُسی طرح حس باطنی کی نزاکت لطیف سے لطیف مشترک اور پوشیدہ سے پوشیدہ
شے کو تیزی ادراک اور نازک دماغی کی مدد سے دریافت کرلیتی ہے۔ صحت مذاق صرف
اُس اصلاح سے متعلق ہے جو قوت مذاق کو ادراک کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے صحیح
مذاق کا آدمی وہ شخص ہے جو مصنوعی محاسن سے کبھی دھوکا نہ کھائے جو ہمیشہ اپنے
دل میں عقل سلیم کا وہ معیار رکھے جس کو وہ ہر شے کی جانچ کے لئے استعمال
کرسکتا ہے وہ ان مختلف محاسن کے عیب و ثواب کا جو اُس کو کسی اُستاد کے کلام میں
نظر پڑتے ہیں۔ مناسبت کے ساتھ اندازہ کرتا ہے۔ اُن کو انکی مقررہ جگہ دیتا ہے
اور وہ اصول قایم کرتا ہے جن سے معلوم ہو کہ ان میں کس بات سے مسرت پیدا ہوتی ہے
اور صرف اُسی درجہ تک محظوظ ہوتا ہے جس درجہ تک اُس کو خوش اور محظوظ ہونا چاہیئے۔
مذاق کو اُسکی اکمل اور اصلاح شدہ حالت میں ظاہر کرلینے کے بعد یہ غور کرنا چاہیئے کہ وہ اس
حالت سے کیونکر تجاوز کرسکتا ہے۔ اس میں کون کون تغیرات واقع ہوسکتے ہیں۔ اور

ان تغیرات کی حالت میں صحیح مذاق کو ناقص سے امتیاز کرنے کا کوئی ذریعہ ہے یا نہیں۔ ہمارے کام کا یہ سب سے مشکل حصہ ہے کیونکہ یہ ایک مسلّم قاعدہ ہے کہ اسپے سہل ہی انسانی طبیعت کا کوئی جزو مذاق سے زیادہ تلون پذیر اور بے ثبات نہیں ہے۔ اس کے تغیرات اسقدر وسیع اور بکثرت ہیں کہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ناشی ہوتا ہے کہ وہ محض بے قاعدہ اور مطلق العنان ہے جس کی کوئی بنیاد اور جسکا کوئی معیار نہیں اور جو بعد میں تمام علوم اور تحقیقاتوں کو فضول اور بیکار کر دیتا ہے چنانچہ فن تعمیرات میں یونانی نمونے مدتوں تک نہایت کامل تسلیم کیے گئے ہیں بعد کے زمانوں میں گاتھک قوم کا فن تعمیر غالب رہا۔ اس کے بعد یونانی مذاق پورے زور و شور سے زندہ اور عوام کی نظروں میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ بلاغت اور شاعری میں ایشیائی قوموں نے سوائے ظاہری نمایش کے کسی چیز کو پسند نہیں کیا۔ علی الرغم اسکے یونانی صرف انہیں محاسن کی قدر و منزلت کرتے تھے جو پاک صاف سیدھے سادے ہوتے تھے۔ وہ ایشیائی تکلفات کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ خود انگریزوں میں صدہا تحریریں جو دو یا تین صدی ادھر نہایت مقبول و مطبوع تھیں اب نہایت بدنام اور گمنام ہیں۔ اردو زبان کی انشا پردازی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ پچیس تیس برس پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب اور امانت کا واسوخت خاص طور پر پسند کیے جاتے تھے لیکن اب ہمارا مذاق سادگی پسند ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان تمثیلات سے کیا نتیجہ مستخرج ہوتا ہے۔ کیا کوئی چیز ایسی ہے۔ جس کو ہم مذاق کا معیار کہہ سکیں جس سے ہم اچھے اور برے مذاق کو پہچان سکیں۔ کیا ہر ایک کا مذاق جداگانہ ہے۔ یہ ایک نہایت ہی نازک اور مشکل مسئلہ ہے جس پر اب ہم بحث کرتے ہیں۔

اگر مذاق کا درحقیقت کوئی پیمانہ یا معیار نہیں ہے تو کل مذاق یکساں ہیں۔ یہ وہ صورت ہے کہ خفیف معاملات اور ادنےٰ اختلافات میں اس سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ لیکن بڑے معاملات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک

بدو کا مذاق ایک ادیب کے مذاق کی طرح نازک اور پیچیدہ ہے۔ ایک باقاعدہ تربیت یافتہ مذاق کانوں اور بالخصوص [illegible] میں موسیقی کے ان باریک نغموں اور زمزموں اور سُروں کی تمیز سے لفظوں اور لہجوں کو پہچان لیتا ہے جو معمولی مذاق سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایک طبیب کا مذاق بیمار کے لون اور اس کے چہرہ پر آنے جانے والی رنگتوں اور اس کے نبض کی رفتار سے صحت اور مرض کو تاڑ جاتا ہے۔ لیکن عام طور سے یہ باتیں درپیش نہیں ہوتیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایک شخص کے مذاق کو دوسرے شخص کے مذاق پر ترجیح دینے کی کوئی بنیاد ہے۔ اور مذاق میں بھی اچھائی برائی اور صحت اور غلطی ہوتی ہے اور انسان میں اختلاف طبائع کے ساتھ اختلاف مذاق بھی لازمی ہے۔ جو ہر مذاق اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اپنی حد میں مکمل کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص کو نظم سے زیادہ دلچسپی ہے دوسرے کو نثر سے۔ ایک رزم پسند کرتا ہے۔ دوسرا بزم کو۔ ایک کلاسیکی کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسرا پیچیدگی کو۔ ایک کو سادگی زیادہ پسند ہے دوسرے کو رنگینی۔ نوجوان پرجوش اور شوخ مضامین سے خوش ہوتے ہیں۔ بعض لوگ بیانات اور خیالات دونوں میں صحت اور باقاعدہ نزاکت کو پسند کرتے ہیں۔

ہر چند ان سب باتوں کا اختلاف ہے۔ لیکن ہر شخص کو کوئی نہ کوئی حسن مدنظر ہے۔ ہر شخص کی طبیعت کے موافق ہے اور اس سے یہ [illegible] کہ کوئی شخص دوسرے کے مذاق پر [illegible] کا مستحق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایک [illegible] صحیح اور باقی غلط ہو سکتے ہیں [illegible] شخص اور آپ کے [illegible] ہو سکتی ہے۔ مذاق [illegible] حالات میں نہیں ہو سکتی۔

ایک شخص ایک شے کو عمدہ بتاتا ہے اور دوسرا پسند نہیں کرتا تو اس کا نام اختلاف مذاق نہیں ہے بلکہ اس کو مذاق کی مخالفت کہنا چاہیے۔ ایک شخص سعدی شیرازی کے کلام کو فردوسی کے کلام پر ترجیح دیتا ہے۔ مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے خیال متخالف اور متضاد ہیں جب تک کہ ہم ان میں سے ایک کے مذاق کو

ترجیح دینے کا صحیح معیار نہ رکھتے ہوں۔ اب یہ دریافت کرنا باقی ہے کہ وہ معیار کیا
ہے جو اس قسم سے تفریق مذاق میں کام آ سکتا ہے۔ معیار ایک صحیح رائے پر پہنچنے سے مراد ہے
جو استفادہ مستند اور معتبر ہو کہ ہر خاص و عام اس کو پسند کریں مثلاً مصر کا بڑی اوزان خانگی
اوزان سے عام طور پر قابل استناد و اعتبار ہیں درباری تربیت کا معیار صحیح کہا جا سکتا ہے

القصہ حسن مذاق در اصل حسن کے ایک اندرونی حس پر مبنی ہے جو انسان نے
اپنی طبعی حالت کے حسب حال پایا ہے۔ اور جس کا ادراک کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔
اب جس انسان میں کل قوتیں تکمیل کے ساتھ موجود ہیں۔ جیسے محسوسات باطنی
ہر حالت میں نہایت نازک اور صحیح ہیں جن کا ادراک بے خطا اور یقینی ہو۔ اُن کی
رائے دوسروں کے لئے ایک مکمل معیار ہو سکتی ہے۔ لیکن اس پر بھی یہ امر ممکن ہے
کہ کوئی مذاق اُن کی رائے سے خوش ہونے والا نہ ہو۔ انسان کے مختلف اور
مخالف مذاقوں کی آزمائش کا کوئی کافی معیار نہیں۔ جس پر سب کو راضی کیا جانا ممکن
ہو۔ اور حسن مذاق کی تمام تجزیوں میں آخری مرافعہ انسان کی عقل اور ماہران فن
کی کثرت رائے پر ہے جو سب سے زیادہ اس کے ماہر اور آشنا ہیں۔ اگر کوئی
شخص کہے کہ شکر تلخ اور تمباکو شیریں ہے تو اسکی کوئی دلیل اثبات کو ثابت
نہیں کر سکتی اس لئے ایسے شخص کا مذاق بیمار سمجھا جائے گا اور صرف اس وجہ
سے بیمار سمجھا جائے گا کہ تمباکو اور شکر کے اکثر جاننے پہچاننے اور اسکو استعمال
کرنے والے افراد اسکے مذاق سے اختلاف رکھتے ہیں۔

ہماری اس تعریف میں کہ فنون میں حسن کی آخری کسوٹی انسان کے خیالات
کی باہمی موافقت ہے، ہمیشہ وہ آدمی مراد ہیں جو اس کے اہل سمجھے جاتے
ہیں۔ اور ان میں وہ اوصاف موجود ہیں جو اس کی جانچ کے لئے ہونا چاہئیں
اور ان کے سچے فیصلوں میں کوئی رعایت و شکایت "تلوین و تلون" پیدا
نہیں کر سکتی۔

اور مذاق کی بے ثباتی اور تلون کے متعلق کچھ ہی کہا جائے لیکن تجربہ سے

یہ بات طے ہو گئی ہے کہ بعض خیالات اگر مناسب صورت میں ظاہر کئے جائیں تو ان میں بلا ارادہ تحریک کام اور کام لینے دینے کی حاصل کرنے کی قوت ہوتی ہے ہر مضمون جو تخیل اور شاعریت سے تعلق رکھتا ہے تو کلیۃً اور ان میں کل خوبیوں کو اچھا سمجھا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسا تاثر ہوتا ہے جو تحریک شاعر سے تجویز لیتی ہے انسانی طبیعت سے ہی ہی آواز بلند کرتا ہے۔ چنانچہ بعض اساتذہ سلف کے کلام کو دنیا کی مہذب شائستہ قوموں نے عام طور پر اور ہمیشہ پسند کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ عام طور پر خصوصیت کے ساتھ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ جیسے مولانا روم۔ حافظ شیراز۔ شیخ سعدی کا کلام۔ اور ہر زبان کا مذاق سلیم اُسکے مطالب سے حظ پاتا اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ اب آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اچھی شاعری آپ کے مذاق کو بزم خلوت و جلوت رفتار و گفتار دربار و بازار کے ہر گوشہ میں ڈھونڈھ رہی ہے۔ اگر آپ اچھے شعر نہ ملنے سے خوش نہیں ہوتے تو وہ کیا مذاق سلیم کی نایابی سے بڑھتی ہے۔

شاعری کا وزن

شاعری کا پہلا کام مناسب درجہ و مقام لفظوں کو سوچنے کا ہے جیسے ایک جڑیا ہیرا یا موتی یا قوت کی کنیوں۔ چنیوں اور چھوٹے بڑے نگینوں کو کسی زیور میں جڑنے کے لئے اپنی قوت ممیزہ سے کام لیتا یا جوہری چھوٹے بڑے موتیوں کو ایک لڑی میں چننے کیلئے ہر دانہ کو اُسکے مناسب مقام جگہ دینے کے لئے پہلے سلک خیال میں جگہ دیتا ہے۔ تاکہ وہ انفاظ شاعری کے رشتہ میں پروئے جاکر اس شعر کا مصداق بنیں۔ میر انیس مرحوم

نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیس
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

دوسرا کام اُن لفظوں کو مناسب موزونیت کے اپنی اپنی جگہ بٹھانے کا ہے۔

اُسی طرح بہت سے بول لئے گئے۔ جیسے عربی، ترکی، یورپ [illegible] انگریزی [illegible] لفظ [illegible]
[illegible] تصرف کیا جیسے [illegible] [illegible] عربی سے براہ
[illegible] آئے تھے اور اُسی صورت [illegible] [illegible]
سے اُردو میں داخل ہوگئے اور اُردو نے [illegible] نہیں [illegible] جیسے [illegible]
[illegible] عربی [illegible] کی صورت [illegible]
جو اُردو میں آکر وہ اصلی صورت سے بدل گئے [illegible]
سے دوسری شکل میں ہوگئے اور وہاں سے دوسری صورت بدل کر آئے اور اُن کی
موجودہ صورت کو اُردو نے قبول کیا۔ عموماً دوسرے ملکوں یا دوسری زبانوں کے
لفظ جو اپنی اصلی یا دوسری صورت میں داخل اُردو ہوگئے کیا نہیں کہ اُن
میں اُردو کا تصرف ہوا۔ اب ترکیب کلام کو دیکھنا چاہئے۔ ایک ترکیب وہ ہے جو ہم
اپنے ملک اپنی قوم اپنے مذاق کے موافق شعر کہیں۔ دوسری وہ ہے جو ہم دوسری
زبانوں کی تقلید میں سخن سرا ہوں۔ پھر اس میں بھی تفریق ہے ایک وہ جو ایشیا
کے مختلف مذاقوں سے حاصل کی گئی ہو۔ دوسری وہ جو ہم نے ایشیا کے مذاق
کو بالکل بھلا دیا ہو اور یورپ کی تقلید میں ہم نے اپنے انداز بیان کو دوسرے طرز میں
بدل دیا ہو۔ جیسے آجکل انگریزی تقلید ہماری تصنیفات میں ترجمہ کی شان پیدا کر رہی
ہے۔ اور ہم اپنے مواد کلام کو بیرنگ کر کے دوسرے سانچوں میں ڈھال رہے ہیں۔
جس میں بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اس مذاق کے پرورش یافتہ نہیں اس لئے ہم اپنی
شاعری کے اوج کمال تک نہیں پہنچ سکتے اور جیسے اُردو میں مختلف لفظوں کی شرکت
اور تبدل نے شاعری میں ایک خاص اثر پیدا کیا ہے ویسے ہی اُردو کی مثالوں اور تشبیہوں
کا وادی بہت وسیع اور نیا پیدا کرتا رہا ہے۔ اور ہر ملک کا درخت اُسکی وادی میں اُگا ہوا
نظر آتا ہے اور بعض درخت تو ایسے ہیں جن کو زمین کی تاثیر اور آب و ہوا کے سبب
اثر نے اُن کے ملکوں سے زیادہ یہاں پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ اُردو کی تشبیہات
میں بھی زیادہ تر فارسی اور کمتر عربی اور متوسط درجہ میں بھاشا کی تشبیہات کا پتا ملتا ہے

اور اب مغربی دنیا کی نظموں میں اس کا نام ہونے کے برابر ہیں۔ اور تشبیہ ایسی چیز ہے جس کی ضرورت نہ صرف شاعری اور ادب میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ انسان کی سرشت میں فطرت کی پہلی چیزوں کی طرح ابتدا ہی سے پایا جاتا ہے اور نا سمجھ گونگے بہرے بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بلکہ حیوانوں میں بھی تصورات تشبیہی کا احساس پایا جاتا ہے۔

ہر قوم اور مذہب کے ادب اور شاعری کی کتابیں طرح طرح کی تشبیہات سے بھری ہوئی پائی جاتی ہیں۔ تشبیہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہ اور غرض تشبیہ اور ادات تشبیہ کا ہونا ضرور ہے۔ بلکہ شاعری کے اصول نے اختیار کیا ہے اور ہر ملک کی مخلوق اور مناظر کی عام پسند دلچسپی کے حسب حال تشبیہات کو اختیار کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے عرب۔ فارس۔ ہندوستان۔ چین۔ یورپ کی تشبیہات اپنے اپنے ملک اور اپنی اپنی طبیعت کے موافق ہیں۔ عرب کی اونٹنی یورپ کے سنہرے بال چین کی گول آنکھیں ہر ایک ملک کے خاص مذاق سے دلچسپی رکھتی ہیں اور قدرت نے ہر قوم کو اپنے حسن اور اپنے ملک کے مناظر کا شیفتہ بنایا ہے۔

استعارہ

شاعری میں استعارہ تشبیہ سے زیادہ لطافت اور ملاحت کلام کی بہ نہایت رکھتا ہے۔ تشبیہ سے مشبّہ اور مشبّہ بہ کے درمیان ایک مغایرانہ فرق معلوم ہوتا ہے مگر استعارہ غیر کو عین بناتا اور مجاز میں حقیقت کی سیر کراتا ہے۔ جیسے میرزا صائب اور غنی کشمیری کے دیوانوں میں تشبیہات کا لالہ زار پھولا ہوا ہے۔ ویسے ہی ملا طغرا کی تصانیف نظم و نثر میں استعارات کی بہار جوش پر ہے اور اردو کے مختلف دواوین سے ہر قسم کی تشبیہات اور استعارات کا اقتباس و انتخاب ہو سکتا ہے۔ لیکن استعارات کا زیادہ ہونا ملاحت کلام کو شورہ زار بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ کہا ہے ؎

نمکِ استعارہ خوش باشد
لیکہ از حد چو رفت شور بود

مبالغہ

ایشیائی شاعری کا مبالغہ بدقسمتی سے بہت بدنام ہے۔ مبالغہ ہماری شاعری
کا مبالغہ شاعر کو جھوٹ سے بچاتا ہے اور جس مقام پر شاعر اپنے معشوق یا ممدوح
کی تعریف حد سے زیادہ کرتا ہے تو کوئی اُسکو واقعات پر خیال نہیں کرتا بلکہ
وُہ عام طور سے مبالغہ خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے مبالغہ شاعر کے انتہائے وسعت
ادراک کا پتا دیتا ہے اور اُس سے عقل و حکمت کے جویا دوسرا ثمرات رکھتے
ہیں مثلاً شاعر نے اپنے ممدوح کے گھوڑے کو ایک ایسا کل کا گھوڑا بنایا
جو اپنے سوار کو شملہ میں لُنچ اور کلکتہ میں حاضری کھلاتا ہے تو اس سے اُس شاعر
کے محسوسات خیالی پر غور کرنا چاہیئے کہ اس کے ذہن نے کس چیز کا ادراک
کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خوش اقبال یورپ کے حکیمانہ خیالات میں ہماری
شاعری کے اعجاز سے زیادہ قابل استعجاب و تسخیر اجزا ہو سکتے ہیں
مثلاً ایک بڑا گروہ ستاروں کی آبادی کا خیال رکھتا اور ستاروں کی آبادی
میں پہونچنے اور وہاں کے رہنے والوں سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے
نپولین نے ڈکشنری سے ناممکن کا لفظ نکلوا دیا تھا۔ اُس کے نزدیک آدمی سب
کچھ کر سکتا ہے۔ پس ان خیالات کے مقابلہ میں آپ کو ایشیائی شاعری کے
مبالغہ پر ہنسنا خود آپکے تصور اذہان کی دلیل ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یونان کا
مشہور شاعر ہومر اندھا تھا اور انگلستان کا مشہور شکسپیر نہایت غریب اور معمولی
اسکول میں پڑھکر تھیٹر میں بھرتی ہو گیا تھا۔ مگر ان دونوں کی شاعری اور ان کے
خیالات کی بلند پروازی نے سائنس اور فلاسفی کا وُہ اثر ظاہر کیا جو آج تک
معجزہ کمال مانا جاتا ہے۔ یہ ہومر اور شکسپیر کی تعریف نہیں بلکہ اقبال مند قوم
اور دقیقہ شناس سوسائٹی کی قدرشناسی ہے۔ جس نے ہومر اور شکسپیر
کی شاعری کو سائنس اور فلاسفی کی وادی میں نمایاں کیا۔ اور شاعری

کے خیالات کو حکیمانہ مذاق میں دکھا اور شاعری سے فنون حکمت کا اقتباس کیا تھا ہماری قوم کو بھی شاعری سے ایسے افادات کا موقع دے اور وہ شاعری سے حکمت کے مصرف میں خرچ کرنے کا دماغ پیدا کرے اور جو خیال خیال کے درجہ ہی میں ہیں یا کسی شاعر نے ایک بات کو قانون شاعری کے خلاف پیش کیا ہے اور اس کا دور از قیاس جھوٹا اپن پسندیدہ نہیں یہ اس شاعر کا جہل یا اس کے ناقابل قدر خیال کا باعث ہے اس سے شاعری کو کیوں بدنام کیا جائے۔

شاعری کی نسبت ایک رائے

نوشتہ مولوی سید محمد حسین صاحب رضوی مدرس اعلئے علوم ریاضی ریاست جھالرا پاٹن مندرجہ رسالہ حسن حیدرآباد دکن۔

نہایت ہی قدیم زمانہ کے سیدھے سادے لوگوں کو جو بین شاعری کیطرف داعی ہوئیں ایک تو انے واقعات دوسرے اپنے جذبات جب لوگوں کو اگلے بزرگوں بہادروں اور دیوتاؤں کے حالات منضبط کرنے کی ضرورت پڑی۔ ان کو چونکہ اس وقت فن تحریر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ کسی ایسی شئے کیطرف رجوع کرنا پڑا جس کا حفظ یاد رکھنا آسان ہو اور جس میں تھوڑے لفظوں میں بہت سا مطلب ادا ہو سکے اس کام کے ادا کرنے کے لئے شاعری سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ تھا کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے اور بوجہ اوزان وتقسیم مضامین وغیرہ نظم کا حفظ یاد رکھنا بہ نسبت نثر کے بہت آسان ہے پس سب سے پہلے اعلئے درجہ کی قسم نظم مثنوی ہے جس میں یا تو کسی بڑے بزرگ کی سوانح عمری ہوتی ہے۔ جو آیندہ لوگوں کے لئے مثال ہو یا کسی بڑے شجاع و دلیر کی جس نے اپنی عزیز زندگی بیچکر اپنے ملک یا اپنی قوم کو کسی بادعظیم سے بچایا ہو حالات ہوتے ہیں یا کسی دیوتا کے جو کسی خاص فرقہ یا قوم پر مہربان ہوتا ہے کرامات اور خرق عادات کا ذکر ہوتا ہے یا اس کے وہ افعال بیان کئے جاتے ہیں جن سے نوع انسان کو فایدہ پہنچا ہو۔ یہ ضرور نہیں کہ کسی خاص مثنوی میں ان میں سے کوئی خاص بات ہو۔ ہر مثنوی

ان حالات کا مجموعہ ہوتی ہے بلکہ اور بہت سی باتیں مثلاً طریق حکومت و طرز معاشرت
بیان کیے جاتے ہیں۔ قریب قریب ہر ایک زمانہ کی ہر مثنوی میں کسی حسینۂ فتنۂ عالم
کا بھی ذکر ضرور ہوتا ہے جیسے حسن عالم فریب پر دنیا کے بڑے بڑے واقعات
رکھے ہوتے ہیں۔ بعض مثنویوں میں بڑے بڑے عمدہ اخلاقی مضامین استعارۃً
بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرا سبب حسن قدرت کی تعریف ہے۔ ان سادہ دل سریع الاعتقاد
بزرگوں کے دل پر قدرتی اشیاء کا حسن اور عجائبات روزگار اپنا اثر کیے بغیر کیونکر
رہتے۔ جس وقت تک مختلف علوم نے انسان کے دماغ پر قبضہ نہ کیا تھا اور انسانی تجربہ
بہت ہی محدود تھا تمام انسانی قوتیں قدرت کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتی تھیں
اور اس سے تجربہ حاصل کرنے میں مصروف تھیں۔ جس وقت قوائے ذہنی نیند کی
طرح سے عالم خواب سے نہ چونکی تھی قوائے وجدانی اپنا پورا کام کر رہے تھے۔ اس وقت
میں ذرا سا ابھارنے والا اثر بھی دل کے ولولوں کو پوری طرح سے بھڑکا دیتا تھا۔
پس حسن قدرت ان لوگوں کے دلوں پر مقناطیسی اثر رکھتا تھا۔ انتہا ہے کہ بعض خوشنما
دلکش۔ منظر فریب فائدہ بخش چیزیں خالق خیال کی جاتی تھیں۔ رات دن کے نظر آنے
والی چیزیں مثلاً آفتاب کا نور۔ چاند کا حسن۔ تاروں کی جھلملاہٹ۔ قوس قزح کی
بوقلمونی۔ آسمان کا نیلا پن۔ بادلوں کی سیاہی اور رفتار۔ صرصر کی تیزی۔ نسیم
صبا کی خنکی ان کے ذہن پر ایسا اثر رکھتی تھیں جن کی وجہ سے وہ عمدہ استعارے اور
سچے مضامین پیدا ہوئے جو اس وقت بھی ایک سچے باذوق پردرد دل کے متحیر
کر دینے کو کافی ہیں۔

خانہ بدوشی کے زمانہ میں جب یہ لوگ اتفاق سے کسی صحرا میں جا نکلے وہاں کے
درختوں کی بہار۔ ہوا کا چلنا۔ خود رو سبزے کا لہلہانا۔ پھولوں کا خداداد حسن۔ شبنم
کے موتی کے قطرے۔ دریا کا بہاؤ۔ پہاڑوں کا جاذب نگاہ سے گذرا اور نوبہار چمن
کی تبدیلی آزمائیں تو فیس بیتاب ہو گئے۔ اور فوراً فی البدیہہ اشعار نظم کے مشغول تبدیل

سے پاک شاعری کے تکلفات سے بالکل مبرا۔ ان میں نہ مبالغہ کی چاٹ ہوتی تھی اور
نہ بیہودہ دور از کار تشبیہہ و استعارات کی چاشنی۔ بلکہ صاف صاف لفظوں میں بے تکلفی
کے ساتھ حسن قدرت کا روشن بیان اور اس اثر کا جو شاعر کے دل پر ہوا اس
عمدگی سے ذکر کیا جاتا کہ جس وقت سنا جاتے سننے والے دل پر وہی اثر ہو
جو شاعر کے دل پر ہوا۔ اور وہی سماں نگاہ کے سامنے پھر جاتے۔

چونکہ انسان مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے خانہ بدوشی کا زمانہ مستقل
اور دوامی نہیں خیال کیا جا سکتا تھا۔ آخر کار سفر ہائے دوامی اور جانوروں کے
چرانے میں لوگ تنگ آ گئے اور یہ وحشیانہ زندگی ان کی کل حاجات کی کفیل نہ ہو سکی
بنا بریں ان کو گاؤں قصبے اور شہر آباد کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کی
ساری ضرورتیں پوری ہوں۔ اور آپس کے خیالات کی تبدیلی سے عقل اور
تجربہ کو کافی مدد پہنچی۔ اور معلومات کا ذخیرہ وسیع ہو۔ اس آپس کے میل جول
اور عقل کی ترقی سے یہ بات معلوم ہوتی کہ انسان اشرف المخلوقات اور عالم
اکبر ہے۔ جو حسن و خوبی خداوند کریم نے ہر ہر مخلوق کو جدا جدا عنایت کیں ہیں وہ
مجموعتاً انسان کو ملی ہیں۔ جب شعرا نے یہ دیکھا اپنی ہی نوع کی مدح میں مصروف
ہو گئے۔ اور وہ خوبصورت پاکیزہ مضامین پیدا کئے کہ جن سے اسوقت بھی ہر شخص
دل آدمی تک پھڑک گئے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے ممدوح یا معشوق ساری جہان
سے نرالے کبھی پرے عالم کے دیوتا خیال ہوتے تھے۔ یہ بیچارے بے دھن اور بے
گھر کے نہیں ہوتے تھے۔ نہ ان کے گیسوؤں کی سیاہی کے سامنے دیدار خدا محال تھا
بلکہ ان کی چال سے والہانہ عشاق پیٹتے تھے اور ان کی ٹھوکروں سے حشر برپا
ہوتا تھا۔ بلکہ یہ اپنے ہم جنسوں کی طرح سب اعضاء رکھتے تھے اور ان میں کوئی
ایسی انوکھی خوبی نہیں ہوتی تھی جو ان کو دائرہ انسانی سے خارج کر دے۔ فرق یہ
تھا کہ اوروں کی نسبت ان کے اعضا سڈول ہوتے تھے۔ اور بعض بعض
اور زیادہ دل کش۔ ان کا قدرتی حسن اور تناسب اعضاء شعرا کو اپنی طرف کھینچے اور

شعرا ان کی مدح میں رطب اللسان ہوتے تھے - مگر وہ تعریف میں حد سے زیادہ تجاوز
نہ کرتے تھے - مبالغہ سے کم کام فرماتے - جو جیسی چیز ہوتی اُس کی ویسی ہی مدح کرتے
جس نے ان کے اشعار پڑھے شخص ممدوح بہ نقشہ آنکھوں میں پھر گیا - جب کسی
بات پر اُن کو زیادہ زور دینا ہوتا زبان کی شستگی الفاظ کی بندش - خیالات کی
پختگی طبیعت کے زور سے اپنا مطلب ادا کرتے - یہ یاد رہے کہ وہ آج کے چاندوبا
شعرا کی طرح تکیہ پر سر رکھے مضمون کے فراق میں ڈھونڈھا نہ کرتے تھے - اور نہ
مجنونوں کے مانند ہر وقت ایک ہی خیال میں مستغرق رہتے تھے - بلکہ ان کا کلام اکثر
فی البدیہہ ہوتا تھا ایک ایک عرب کا بدو کسی میلے میں پانچ پانچ سو اشعار کا قصیدہ
نظم کرتا اور اپنی ذہانت اور روانی طبع کی داد پاتا - آج تک اس ملک میں جب
علما میں زبان کی بابت مباحثہ ہوتا ہے یہی ناخواندہ جنگلی اعرابی حکم ہوتے ہیں
اور ان کی رائے زبان کے بارہ میں حکم ناطق کا اثر رکھتی ہے - یہی حال اُس
زمانہ میں اور ملک کے باشندوں کا ہوگا - طرہ یہ کہ اس وقت کے فی البدیہہ اشعار
آج کل کے ان اشعار سے جو نہایت عرق ریزی اور دردِ سر کے بعد میسر آتے
ہیں - بدرجہا عمدہ ہیں - ان اشعار کی تشبیہ ایک ایسے معشوق سے دی جا سکتی ہے
جو اپنے حسن خداداد کے سامنے کسی عارضی سامان آرائش کی کچھ حقیقت نہیں
سمجھتا - اور خود اپنی زیور سادگی پر مفتون ہے اور آج کل کے نظم کی مثال اُس
بوڑھی بازاری عورت کی سی ہے - جو نہایت بناؤ سنگار کر کے لوگوں کو اپنی
طرف مائل کرنا چاہتی ہے - مگر ذرا غور سے دیکھنے سے اُسکے حسن کی قلعی کھل جاتی
ہے - بات یہ ہے کہ ہر چیز کے واسطے ایک وقت مناسب ہے جس پر اُسکی بہار دلفریب
اور خوشنما معلوم ہوتی ہے پس شاعری کے واسطے وہی زمانہ موزون تھا - ہمارا زمانہ
دوسری چیزیں چاہتا ہے - اب انسان کے اُس جوہر شریف یعنی عقل کو جو انسان و حیوان میں
مابہ الامتیاز ہے پوری ترقی ہو گئی ہے اور ہوتی جاتی ہے - عقل سلیم کب قوت اختراعی کے
عجیبہ ڈھکوسلوں کو پسند کر سکتی ہے اور پسند بھی کرتی ہو مگر شاعری کی افراط و تفریط کو

قبول کی رائج ہے - اب زمانہ علوم حکمیہ کا ہے - اصلی شاعری مدتوں سے رواج ہو چکی یہ زمانہ جسکو ہم بیان کر رہے ہیں شاعری کے زمانہ کا تھا جب اپنی غائت خصوصیت پہنچ چکی - اُردو کا علم بلند ہوا اور اس کے نام کا خطبہ چہار دانگ عالم میں پڑھا گیا۔

مستقل طور سے آباد ہو جانے کے بعد ایک مدت دراز تک تو لوگ اپنے پرانے طرز کو نباہتے رہے - آخر انسان کی جدت پسند طبیعت اپنا رنگ لائی - اب ان کو یہ سیدھے سادھے گو سچے مضامین پھیکے اور بے مزہ معلوم ہونے لگے - زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ شاعری نے بھی پلٹا کھایا - طرز معاشرت کے بدلتے ہی اس نے بھی نیا روپ بھرا - سامان عیش کا بڑھنا تھا کہ انسان کے خیالات میں تغیر عظیم پیدا ہوا - اور اس تبدل نے شاعری کو بھی اچھوتا نہ چھوڑا - اب شعراء نے اپنے خیالات کو لفظوں کا زیور اور تکلف لباس پہنانا شروع کیا ایسی ایسی انوکھی باتیں پیدا کیں جو اگلے بزرگوں کو خواب میں بھی نظر نہ آئیں - سیکڑوں قیدیں لگا دیں اور شاعری جیسی آسان چیز کو پہاڑ سا مشکل بنا دیا - ردیف و قوافی اگرچہ اس سے پہلے زمانہ کی شاعری میں بھی موجود تھے - مگر اب ان کی سختی سے پابندی کی جانے لگی کہ وہ اس کی قدرتی ترقی کی سد راہ ہوئی - بحور و اوزان ایجاد ہوئے - کوئی کلام موزون جس کا قدم ان بحروں کے حدود احاطہ سے نکلا ہوا ہو - نظم نہیں خیال کیا جاتا - نظم کی مختلف قسمیں مقرر کر دیں - جن سے علیحدہ ہو کر کوئی شخص طبع آزمائی نہ کر سکتا - اس قسم کی قیدوں سے جب شاعری کی اصلی ترقی تنزل کی طرف مائل ہوئی تو اس نقص کے چھپانے کے لئے لفظی اور معنوی صنعتیں پیدا کی گئیں ان پر دور از کار تشبیہات و استعارات اضافہ کئے گئے - پھر ان سب کو مبالغہ کے چھلکے میں کھینچ کر مصنوعی شاعری کا حسن دوبالا کیا گیا - گو اس طرح سازی سے شاعری کا قدرتی حسن چھپ گیا اور ان اضافی حدود و شرائط سے فن شاعری کا نشافت ہو گیا مگر پھر بھی ہنرمند شاعروں نے اپنی دماغی

قوت کے زور سے ایک ایسا سڈول اور انوکھی تراش و خراش کا معشوق بنا دیا جسکے حسن نظر فریب سے ایک مدت تک عالم نے دھوکا کھایا اور اس مصنوعی تراشیدہ بت کو اصلی اور قدرتی دلربا گردانا واقعی نقل کو اصل اور آورد کو آمد کر دکھانا انہیں ہنرمند اور اپنے زمن کے پکے شاعروں کا کام تھا۔

اگرچہ شاعری کی بہار اُسیوقت سے ختم ہو چکی تھی۔ جب سے آمد کا زمانہ رخصت ہوا۔ مگر ابھی پت جھڑ شروع نہوا تھا۔ یہ نوبت اس وقت پہنچی جب انسانی تجربہ کافی طور سے وسیع ہو گیا۔ جس طرح عقل و دیگر قوائے ذہنی کو ترقی ہوتی۔ انسان کو شاعری کے طلسم سے نجات ملتی گئی۔ اس جادو کے اثر کو قی علوم کے منتر نے زائل کیا۔ جب انسان کو اتنا ہوش ہوا کہ وہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے۔ دنیا میں بہت سے عمدہ اور مفید علوم کی بنیاد پڑی۔ اب ذہنیات۔ طبیعات۔ فلکیات۔ ریاضی۔ طبابت وغیرہ علوم کی کتابیں مدون ہونے لگیں۔ جب ان علوم کے مصطلحات پر مغز مضامین بالتفصیل بیان کی شاعری میں گنجایش نہ دیکھی۔ مجبوراً نثر کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اب چونکہ فن تحریر بھی ایجاد ہو چکا تھا اس وجہ سے علوم کے حفظ یاد رکھنے کی بھی ضرورت نہ رہی یہ نثر کی طرف مائل ہونے کا دوسرا سبب ہوا۔ اب نظم کی سلطنت بہت محدود ہو گئی اس کا صرف علم ادب میں حصہ رہ گیا۔ جب شعرا نے دیکھا کہ ان کی برتری کو زوال ہونے والا ہے۔ اب عقل کے سامنے قوت اختراعی کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کسی طرح حکما۔ علما۔ اور فلسفہ دانوں کے برابر نہیں خیال کئے جا سکتے تو انہوں نے مصنوعی شاعری کے دامن میں پناہ لی اور انسانی وجدانیات پر اپنا تسلط کیا۔ ایسے مضامین اور ا سکتے جن کے سننے سے انسان کے فطری جذبات جوش میں آجائیں اور جس قسم کا مضمون ادا کیا جاتے اس کا دیسا ہی اثر انسان کے دل پر پڑے۔ اخلاقی اور تمدنی مضامین کی پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ ان کو اس خوبی خوش اسلوبی

نرالی بندش نئی ترکیب کے روشن الفاظ پر اثر پیرایہ میں نظم کیا کہ جس سے انسان
کی طبیعت بے چین ہو جاتی تھی اور واقعہ کی تصویر نگاہ میں پھرنے لگتی ان مقامات
کی سچائی - سادگی - برتری - عمدگی نے بھی نظم کو اپنے اصلی پایہ شرافت سے گرا
دیا بلکہ ایسی شاعری انسان کے اخلاق کے زوال پر ان کی طرز تمدن کی مصلح
ان کے علم ادب کی حامی - ان سے جذبات کی ترقی کا خیال کیا جانے لگی
اور شعرا کو لوگ اسی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے رہے جس نگاہ سے
شعرا نے زمانہ کی رمز کو نہ سمجھا یا سمجھ کر تجاہل عارفانہ کیا - انہوں نے خود اپنے پاؤں
پر کلہاڑی ماری اور اپنے ہاتھوں اپنی پت گنوائی - یہ بھی واضح رہے کہ سب
ملکوں میں ترقی ایک ساتھ نہیں ہوئی - اسی وجہ سے سب ممالک کے ایک ہی زمانہ
کے شاعری کا رنگ یکساں نہیں ہے بلکہ جس طرح ایک ملک نے مدارج ترقی کو طے
کیا - اسیطرح شاعری میں تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں -

ہر زمانہ میں طرز سلطنت کا شاعری پر بہت بڑا اثر پڑا جن ملکوں میں جمہوری
سلطنت کے اصولوں کی کچھ نہ کچھ بو موجود تھی وہاں کی شاعری بھی آزاد رہی -
اسکے قدرتی حسن کو کسی چیز نے نہ بگاڑا اور کوئی امر اس کی قدرتی ترقی کا
سد راہ نہ ہوا - وہاں کے شعرا نے اس بدترین قسم نظم یعنی قصیدہ گوئی میں طبع
آزمائی نہ کی - میں نے قصیدہ کو بدترین قسم نظم اس غرض سے کہا ہے کہ آج کل کے
قصائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باستثنائے چند کل قصیدوں میں بجز جھوٹی
خوشامد - بیہودہ گوئی اور لغو مضامین کے اور کچھ نہیں ہوتا - قصیدوں سے فقیری کی
صدا کا کام لیا جاتا ہے - قصیدہ گوئی کا مقصد و مطلب یہ ہے کہ ممدوح کو احمق بنا کر
اس سے کچھ روپیہ وصول کیا جائے ان لوگوں کی شاعری کسی خاص کی قدردانی اور
سرپرستی پر موقوف نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے کلام کی وہ ملک سے داد چاہتے تھے - اور
ملک ان کو اعلے قدر مراتب داد دیتا تھا شخصی سلطنتوں میں جس طرح اور شخصی
قوتیں اپنے کمال عروج پر نہیں پہنچ سکتی تہیں - اسیطرح قوت تخیلہ اختراعی کو

خاص حصہ ہے۔ اخلاق اور تہذیب و تمدن کی اصلاح جسقدر اس کے ذریعہ سے ہوئی اور وسائل سے اسقدر ناممکن تھی۔ یہ دنیا کے کاروبار میں اس کی ساتھی اور تنہائی کے عالم میں اسکی مددگار رہی ہے کسی میں بھی اس نے انسان کا ساتھ نہ چھوڑا اور مصیبت کے وقت میں اپنے آپ کو ایک سرچشمہ تسکین ثابت کیا۔ لڑائی میں بھی اس نے کار نمایاں کئے۔ یہ مشہور ہے کہ ایک خاص لڑائی میں سپارٹا (Sparta) والے صرف ایک شاعری کی مدد سے کامیاب ہوگئے اور اس تنزل کے زمانہ میں بھی یونان کی آزادی کا باعث یہی شاعری ہوئی۔ لارڈ بیرن کی پرجوش نظم سے ان کی حمیت کی رگ جوش میں آئی اور انہوں نے از سر نو اپنی آزادی حاصل کی۔ زمانہ جاہلیت میں یہی عرب کا شغل تھا۔ جنگ کے وقت ان کی عورات کچھ جوش دلانے والے اشعار گاتیں جس سے ان کا دریائے شجاعت جوش زن ہوتا اور وہ اپنے دشمن کے مقابل ہوتے یا اس پر فتح حاصل کرتے یا اپنی جانیں نثار کر دیتے۔ غرض وجدان شاعری کا پورا تسلط تھا۔ اس کے ذریعے سے انسان کے فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت ہوتی جس سے دنیا میں بڑے بڑے کام ظہور میں آئے چونکہ شاعری کا ماخذ قوت متخیلہ اختراعی ہے پس ایک خاص حد تک شاعری کی خوبیاں خوب ہوتی ہیں مگر جب اس میں انسان حد سے زیادہ منہمک ہوتا ہے تو وہ خوبیاں برائی کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور شاعری سے اخلاق و دماغ کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہوتا ہے۔

ایک شخص جو اکثر خیالی عجائبات کی سیر میں مصروف رہتا ہے۔ اسکو زندگی کے واقعات نفس الامری سے تشفی نہیں ہوتی بلکہ وہ خیالی باتوں کو سرچشمہ تسکین سمجھنے لگتا ہے۔ اس کو روزمرہ کی تحریک دلانے والے وسائل پھیکے اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور حقایق سے بالکل دلچسپی نہیں رہتی۔ ہمدردی سنگینی دل کے ساتھ بدلجاتی ہے اور خودغرضی انسان کے دل کا قبضہ کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اچھا خاصہ شیخ چلی ہوجاتا ہے۔ یہ نقصانات ہیں جو اخلاق کو پہنچتے ہیں۔

دماغ کو جو صدمات ہوتے ہیں وُہ یہ ہیں کہ حد سے زیادہ قوت متخیلہ کی مصروفیت سے سچے واقعات اور جھوٹے اختراعات میں کچھ مابہ الامتیاز باقی نہیں رہتا اور دونوں کی مختلف شکلیں بالکل مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ خیالات روشن کا اعتقاد ہمنان ہوتا ہے۔ زیادہ مصروفیت سے خیالی باتوں میں حقانیت، پیدا ہوجاتی ہے اور اعتقاد کو استحکام ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وُہ لوگ جن کو مبدء فیاض سے اعلےٰ قسم کی قوت متخیلہ عطا ہوئی ہے۔ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کے خیالات اور ان کے اختراعات واقعات اور حقائق کے ہم پلہ ہیں۔

اردو زبان کی شاعری

اس بات کی چھان بین کرناکہ اردو زبان نے کب اور کن وجوہ سے جامۂ ہستی پہنا اور کس کس زمانہ میں اس میں کیاکیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ہماری بحث سے علیحدہ ہے۔ یہاں اسقدر کہدینا کافی ہے کہ اس زبان نے سنسکرت کی زمین میں فارسی کی آب و ہوا سے نشوونما پائی۔ اگرچہ نظم لکھے جانے کے بہت قوی اسباب موجود نہ تھے مگر پھر بھی حسب دستور نظم ہی نے پہلے پہل اس زبان پر قبضہ کیا۔ اور جس طرح ہر ملک میں شاعری کی ابتدا اور اُس کا عروج زمانہ جہالت میں ہوتا ہے اُسیطرح اردو شاعری کا ستارہ بھی اُسوقت طالع ہوا۔ جب مشرقی علوم کی شمع چراغ سحری تھی بلکہ گل ہوچکی تھی۔ اور ہنوز نئی روشنی کا آفتاب افق مغرب سے طلوع ہوا تھا۔ اُس کا عروج اُسوقت ہوا۔ جبکہ سپیدۂ سحر نمود ہوچکا۔ مگر ابھی تک ایک عالم خواب جہالت سے نہ چونکا تھا۔

متقدمین شعرا اردو کو بھی کسی نئی چیز کے ایجاد کرنے کا فخر حاصل نہیں ہے۔ البتہ ان کو خیالات کے مترجم ہونے کی عزت حاصل ہے۔ ان لوگوں نے براہ راست قدرت سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اور نہ اپنی شاعری کے لئے کوئی جداگانہ قواعد مقرر کئے ان کے واسطے شاعری کی سڑک تیار تھی یہ آنکھیں بند کرکے اُسی سڑک پر ہولئے

فارسی شاعری کو دیکھی شاعری کا چسکا نہ جانکر اسی کی تتبع کرنے لگے۔ فارسی میں جو اقسام شاعری کے تھے انہیں پر اردو نظم کو بھی منقسم کیا۔ اسی زبان سے بحر اور اوزان عاریتاً لئے۔ وہی صنائع اور بدائع اپنی شاعری کے لئے قرار دے۔ قوافی و دیگر قیود نظم میں بھی اسی زبان کا چربہ اتارا۔ غرض جو تقلید کے معنے ہیں وہ پوری طرح سے ادا کئے گئے۔ اردو شاعری کو بچپن ہی سے رنگ لگ گیا۔ یہ بچہ ابھی اچھی طرح چلنے ہی نہ پایا تھا کہ اس کے پاؤں میں سونے اور بھاری زنجیریں پڑ گئیں۔ اس وجہ سے اس زبان میں قدرتی شاعری کا پتہ نہیں۔ مصنوعی شاعری البتہ موجود ہے۔ اسمیں نہ فطری جوش ہے اور نہ قدرتی ولولے۔ وارثوں کے ہوتے مشعرا کے پرانے خیالات موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس خاص لائن میں انہوں نے نمایاں ترقی کی۔ اور بعض بعض حالات میں اپنے استادوں سے گوئے سبقت لے گئے۔

اور قیود کو نظر انداز کرکے صرف قافیہ کو ملاحظہ کیجئے۔ اس سے شاعری کی اصلی ترقی کو سخت نقصان پہونچا۔ بیشک خاص خاص موقعوں پر قافیہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ مگر ایسی درجہ کی شاعری میں یہ مانع حسن کلام ہے۔ کسی شاعر کی طبیعت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اس کے اشعار سے کبھی ممکن نہیں کیونکہ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنے خیالات کو ادا نہیں کرسکتا بلکہ اپنے طبعی جوش کو روک کر پہلے اس کو قافیہ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اور پھر مضمون کو قافیہ جیسا چاہتا ہے ویسی اسکو اپنی مرضی کے خلاف لکھنا پڑتا ہے۔ پھر قافیہ کوئی آسان چیز نہیں یہ ایسی مشکل شے ہے کہ ایک جداگانہ علم قرار پاگیا ہے۔ جسمیں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جس طرح شاعری کا قافیہ سے ہمراہ ہے اسی طرح قافیہ کی وسعت کو ایطاء جلی و ایطاء خفی [illegible] محدود کیا ہے ایک شاعر بیت [illegible] [illegible]

تھوڑے اشعار اور معمولی خیالات میں قافیہ نبھ سکتا ہے - اسلئے درجہ کے سلسلہ
اور طولانی نظموں میں اس کی پابندی سخت مشکل ہے - مگر اردو میں قافیہ کی بہت سخت
پابندی کی گئی ہے جسکی وجہ سے کوئی پایہ کی بڑی نظم نہیں لکھی گئی - یہ بھی بہت
غنیمت ہے کہ بعض خوش طبع و ذکی لوگوں نے باوجود اس سخت قید کے ایسے
اشعار لکھے ہیں کہ جن کے سننے سے طبیعت وجد کرتی ہے - اگرچہ ان سے بھی کوئی نئی
دلچسپ دل کی بے چین کرنے والی - پر مغز مسلسل طولانی نظم نہیں لکھی گئی - ایسی
نظم کی اردو میں بہت ضرورت ہے جسکے بغیر اس زبان کی شاعری ناکمل ہے -

دوسری مصیبت اردو شاعری میں رعایت اور ضلع ہے - یہ ایسا عام مرض ہے
کہ اس سے کسی زبان کی شاعری محفوظ نہیں اور غالباً تمام ملکوں کے بڑے بڑے
سخن سنج اور سخن فہموں کو اس نقص کا اعتراف ہے اردو کا ذکر بالتخصیص اسغرض سے
کیا گیا کہ مضمون ہذا کے شق ثانی کی سرخی اردو شاعری ہے - علاوہ اس کے اردو
شاعری میں رعایت کی رعایت اس درجہ کیجاتی ہے کہ شاعر کو نفس مضمون کا مطلق
خیال نہیں رہتا اور بیچارہ رعایت کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے - اس خامی میں خالی
شاعری کا قصور نہیں وہ بھی غریب مجبور ہے ملک کا مذاق ہی ایسا بگڑا ہوا ہے
کہ سادگی لوگوں کو پسند ہی نہیں - اکثر مشاعروں میں دیکھا گیا ہے - کہ سلیس عبارت
اور پر مطلب شعر کی کوئی داد نہیں دیتا - پر تصنع - پیچیدہ - اور لغو شعر پر وہ ہنگامہ
برپا ہوتا ہے - کہ کان کے پردے پھٹنے لگتے ہیں - پس کچھ تو شعرا کی طبعیتیں رعایت
پسند اور کچھ ملک کا مذاق رنگین - اور لنگڑتے کو ٹھیلتے کا بہانہ - شاعروں نے وہ وہ
پر رعایت شعر نکالے کہ جن عوام کے مذاق کو کسی قدر بدل دیا مگر صاحبان ذوق
سلیم کو خود شاعری ہی سے ایک قسم کی نفرت ہوگئی - رعایت کے بھی دو پہلو ہیں
ایک اچھا اور ایک برا - اچھا پہلو یہ ہے کہ کسی شعر کے الفاظ میں رعایت بیساختہ طور
پر موجود ہو - اور اس میں بناوٹ نہ پائی جائے - ایسی رعایت شعر میں ایک خوبی
پیدا کردیتی ہے - مگر اسکا عکس یعنی ایسی رعایت جس میں بالکل تصنع پایا جائے

اور یہ کی نادر ہے کہ کوئی شعر گڑھا جا سکے۔ بدنما معلوم ہوتا ہے۔ متعدد قسم کی رعایات کی ایک بڑی پہچان یہ ہے۔ اگر اس شعر کو جس میں رعایت ہو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے تو اس رعایت کی خوبی نہ رہ سکے۔ ورنہ وہ رعایت ہیچ ہے۔

شاعری کے دلچسپ ہونے کے جو اسباب ہوتے ہیں، اُن میں سے اردو شاعری میں ایک بھی موجود نہیں۔ نہ اس میں اخلاقی مضامین ہیں۔ اور نہ تمدنی معاملات تاریخی باتیں ہیں، ورنہ قومی حالات۔ عشقیہ مضامین کی یہ شاعری ایسی گرویدہ ہے کہ گویا اس میں دوسرے مضامین کی گنجائش ہی نہیں۔ اس کے مطالعہ سے اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ایک نامرد ہوا پرست ہے اور سب کے سب مرید عشق کا تن پھیلا ہوا ہے۔ عشق کا بھی اگر سچا نقشہ کھینچا جائے تو کچھ کم نہیں ہے مگر بالکل بے معنی باتیں انسان کے دل پر کیا اثر رکھ سکتی ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایسی تصویریں ہیں جو اس دنیا کے باشندوں سے کچھ مشابہت نہیں رکھتیں تو ہم کو کچھ تحریک نہیں ہو سکتی بلکہ اُن سے ایک قسم کی ہیبت سمائی ہے جو ہمارے اصلی جوش کو فرد اور ہمارے زندہ دل کو مردہ بنا دیتی ہے۔

ہمارے شاعروں نے جب دیکھا کہ ان کا معشوق (یعنی شاعری) سادگی کی خوبیوں سے قطعی معرا ہے۔ تو انہوں نے اس کے واسطے تشبیہ اور استعارات کا زیور تیار کیا۔ اور اس کو اس ترکیب سے سنوارا کہ اس کے ساتھ لوگوں کو ایک قسم کی دلچسپی ہو گئی۔ اسی پر انہوں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ اس زیور سے اس کو ایسا لاد دیا کہ اس کی اصلی شکل بالکل چھپ گئی اور نزاکت کے بجائے اس میں ایک طرح کا بھدا پن آگیا۔ گو معمولی آنکھ اس نقص کو نہ دیکھ سکی۔ مگر نظر باز نگاہ پر اس کی قلعی کھل گئی۔ گو ان کو قدرتی شاعری سے حصہ نہیں ملا۔ مگر مصنوعی شاعری کو درجہ کمال پر پہونچا دیا۔ انہوں نے خیالی بنیاد پر ایک شاندار خیالی عمارت چنی جو خیالی دنیا ہے

سے خفقان والوں کے لیے ایک نکتۂ بصیرت ہے۔ اور تامل کی ایک چیز ہے۔ چونکہ اس شاعری
کی بنیاد ہی واقعیت پر نہیں بلکہ خوشامد اور تعریف کو بھی ترقی بنا دیتے ہیں۔ ترقی رفتہ رفتہ
اس انتہا تک پہنچی تشبیہ در تشبیہ اور استعارہ در استعارہ ہوتے گئے۔ اس مبالغہ کو اور مضاعف کیا گیا
یہاں تک کہ کوئی معمولی مبالغہ نہیں بلکہ انتہا درجہ کا مبالغہ ہے۔ ایسے شعر پڑھ کر
معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے خیالات نہیں بلکہ کسی ایسے شخص کے
ہیں۔ جو عالم بالا کا رہنے والا ہے۔ اور وہ انسانی طبیعت انسانی جذبات اور
معاملات کو مطلق نہیں سمجھتا۔ ہمارے شعرا نے مبالغہ میں یہاں تک سبقت
حاصل کی ہے کہ ان میں اور ایک مجنوں میں صرف اسقدر فرق ہے کہ وہ جو کچھ کہتا
ہے اسکے سچ ہونے کا بھی یقین رکھتا ہے اور یہ جو کچھ فرماتے ہیں اسکو سچ
نہیں سمجھتے۔ اگر یہ فرق بھی اٹھ جائے تو ایک شخص کو شاعر اور پاگل کی شناخت
میں سخت دقت واقع ہو۔

اردو نظم کی چار بڑی قسمیں ہیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ مرثیہ۔ ان چاروں
پر میں علیحدہ علیحدہ ریمارک کروں گا۔ ہمیشہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں مثنوی ایک
اعلےٰ درجہ کی نظم خیال کی گئی ہے۔ معمولی شعرا کے خیال کے پرواز سے اس کا درجہ
بہت بلند ہے۔ ہر ملک میں مثنوی پر ایسے شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ جو اُس
زمانہ اور اُس ملک میں اپنا ہمسر نہیں رکھتے تھے۔ اور جنکی نکتہ سنجی اور بلند پروازی
مسلم ہوتی تھی۔ اور جن کے معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع ہوتا تھا۔ اکثر ان میں
کے بڑے جلیل القدر عالم تھے اور بڑے نامور حکیم تھے۔ اس کلیہ کی وجہ یہ
معلوم ہوتی ہے کہ مثنوی ایک مسلسل طولانی اور پُر مغز نظم ہوا کرتی ہے۔ اس کا
مضمون نہایت اعلےٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اس میں تاریخی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ قومی۔
سچے منطقی معاملات فلسفیانہ طور سے ادا کئے جاسکتے ہیں۔ تمام دنیا کی بڑی
بڑی مثنویوں میں ایسے ہی حالات ہیں۔ اردو زبان میں اوّل تو مثنویاں بہت کم
لکھی گئی ہیں۔ اور جو لکھی گئی ہیں۔ ان میں ایسی باتوں کا کہیں پتہ بھی نہیں

کسی مجہول سے شخص اور لکھنؤ کے کسی شاعر نے نظم کر دیا - جن لوگوں کا مثنویوں میں ذکر ہے خود شاید کبھی اس دنیا میں پیدا بھی نہیں ہوئے - فرضی اشخاص مان لئے گئے اور ان کی طرف فرضی باتیں منسوب کر دی گئیں - اس پر ایک اور غضب کہ سوا جھوٹے عشقی باتوں کے اور ان میں کچھ نہیں - اس پر بھی اس زبان میں دو ایک مثنویاں ایسی ہیں جو وقعت کی نگاہ سے دیکھی جا سکتی ہیں - اُن سے اور کچھ نہیں تو شعرا کی زبان کی شستگی خیالات کی پختگی ان کی طبیعت کی روانی جھوٹ کو سچ کر دکھانے کی قابلیت پائی جاتی ہے - بیشک جھوٹ کو سچ کر دکھانا ہمارے شاعروں ہی کا کام ہے -

قصیدہ - یہ قسم نظم - ننگ شاعری ہے - معدود سے چند قصیدوں کو چھوڑ کر جو بزرگانِ دین کی شان میں لکھے گئے ہیں - اور سب قصائد بادشاہ امرا اور دولت مند لوگوں کی شان میں تصنیف ہوتے ہیں، کچھ تو ممدوح خوشامد پسند اور کچھ مداحوں کو ان سے وصول کرنا منظور - اس سبب سے قصیدوں میں دروغگوئی کذب خوشامد سے وہ کام لیا ہے کہ الاماں - ایک قصیدے کو پڑھ کر کوئی عقلمند یہ نہیں بتلا سکتا کہ اس میں کسقدر سچ ہے اور کس قدر جھوٹ - دونوں کی اگر نسبت نکالی جائے تو شاید سچ اتنا ہو جتنا آٹے میں نمک - بلکہ اس سے بھی کم - کسی شکستہ حال رئیس کا اگر جمشید کو دربان سکندر کو غاشیہ بردار بنایا تو سمجھئے کہ کچھ تعریف نہ ہوئی - کسی کمزور کو اگر رستم ثانی کہی بخیل کو اگر حاتم کا جواب - کسی ظالم کو نوشیرواں وقت ٹھہرایا تو اُس کے لئے ہجو کی - کیونکہ مبالغہ کی بدولت یہ نامہائے نامی ایسی چیز ہو گئے ہیں - کہ ان کو خادم بنا دینے سے بھی کچھ ممدوح کی عظمت نہیں ثابت ہوتی - ہاں مدح میں اگر انبیاء نہیں بلکہ خدا کے صفات ثابت کئے جائیں تو سمجھئے کہ کچھ تعریف ہوئی - الغرض اگر غور سے دیکھئے تو قصیدے سے ممدوح کے صفات پر اُلٹا پردہ پڑ جاتا ہے - اور اگر خود ممدوح اپنی مدح پڑھے اور ذرا تامل کرے - تو

معلوم ہو جائے کہ اسکو کس قدر بنا دیا گیا ہے - اور اگر ذرا غیرت کریں تو بھی کام فرشتے تو بیچارے کو مرنا پڑے - کیونکہ نہ وہ صفات اس میں موجود ہوں گے اور نہ وہ اپنے آپ کو جینے کے قابل خیال کرے گا- ہمارے شعرا نے جھوٹ اور خوشامد کو اپنے فرائض منصبی میں داخل سمجھ لیا ہے- وہ یہ نہیں جانتے کہ ایسی ہزلیات سے شاعر کا رتبہ بہت بلند ہے - اسکو خلاصۂ وقت اور وکیل دوراں ہونا چاہئے اور اس کے کلام کو اس وقت کے خیالات کا آئینہ - یہ بھی بہت غنیمت ہے - کہ قصیدہ گوئی کوئی آسان کام نہیں - بڑے بڑے نامی شعرا نے قصیدے لکھے ہیں - اگر کہیں چھوٹی امت کے لوگوں کو بھی قصیدہ لکھنے پر دسترس ہوتا تو خدا جانے بیچاری شاعری کی کیا گت ہوتی -

غزلیات کی اس شاعری میں وہ کثرت ہے کہ گویا غزل شاعری کا مرادف ہو گئی ہے - اگر کوئی شخص ایک شاعر کی اپنی دستی تصویر کھینچے تو وہ لباس غزل گو میں اس کو دکھلائی دے گا -

غزل میں کچھ ہجر کی آفت وصال کے اشتیاق انتظار کی مصیبت وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے - اس خاص شاخ میں شعرا نے نمایاں ترقی کی ہے - اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اول تو غزل کے اشعار کم ہوتے ہیں - اور پھر ان میں کچھ علاقہ نہیں ہوتا - یہاں تک بے تعلقی بڑھی ہوئی ہے کہ دو شعروں کے مضمون میں بھی مطابقت نہیں ہوتی ایک شعر میں معشوق کی زلف کی تعریف ہے - تو دوسرے میں ہجر کی مصیبت کا ذکر ہے تیسرے میں وصال کی امید کا اظہار چوتھے میں انتظار کی تکالیف کا بیان - پانچویں میں معشوق کی بیوفائی کی شکایت غرض مطلع سے مقطع تک مختلف مضامین ہوتے ہیں - اگرچہ یہ معمولی باتیں بھی اس غیر قدرتی طور سے جو اس شاعری کا خاصہ ہے ادا کی گئیں ہیں - مگر ایک خیال نہایت ہی تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے - ہمارے شعرا اپنے معشوق کو اس درجہ بیوفا باندھتے ہیں - کہ اس کو دوسروں کا عاشق گردانتے ہیں - اور اپنی طرف اسکی

کم استغنائی کی شکایت کرتے ہیں - اور باوجود اس کی بے اعتنائی کے خود مرے جاتے
جاتے ہیں - اس ناپاک مضمون میں عجیب عجیب باریکیاں نکالی گئی ہیں سمجھ میں نہیں آتا
کہ ایسے ہرجائی معشوق - کہ جو ہر کسی کے گرویدہ ہیں - اور اس کی تعریف میں انکی طبیعت
اور زبان کیونکر یاری دیتی ہے - بہرحال اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں -
اوّل ہمارے شعرا جھوٹے عاشق ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا جذبہ
عشق کچھ تاثیر نہیں رکھتا -

دوم پردے کی شدہ رسم کی وجہ سے عام طور پر اظہار عشق کا موقع نہیں تھا -
مجبوراً وہ ارباب نشاط کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں - اور اس قدر کی بدعنوانی
ضرب المثل ہے - یہی رسم پڑی - جیسا کہ خود جناب الطاف حسین حالی سلمہ اللہ تعالےٰ
نے حیات سعدی میں فرمایا ہے - اظہار امرد پرستی کا بھی باعث ہوئی - اس زمانہ
میں غزل گو شعرا کی وہ افراط ہے کہ ہماری غزل کا بھی قافیہ تنگ ہے جسکو دیکھئے اسی
خبط میں گرفتار ہے - خداوند کریم اس وبائی مرض کو جلد دور کرے اور لوگوں
کو اسکے چنگل سے نجات بخشے - آمین -

مرثیہ اگرچہ واقعہ جانگداز کے بیان کو کہہ سکتے ہیں - مگر اردو زبان میں جناب امام حسین
علیہ السلام کے حالات اور معرکہ کربلا کے پرحسرت اور اذیت ناک واقعات کے
ساتھ مخصوص ہے - اور اگر مبالغات کو علیحدہ کر کے بھی دیکھا جائے تو اردو میں صرف
یہی ایک قسم کی شاعری ہے جس میں اخلاقی مضامین ادا کئے گئے ہیں - اگرچہ اس میں
بھی تشبیہ اور استعارات کی افراط ہے اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں حد
سے زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - مگر ان نقصوں کی رعایت کے بعد بھی مرثیہ اپنے
بلند پایہ سے نہیں گرتا - وہ ایک کلام جامع ہے جس میں ہر قسم کے مضمون سے
انسان لطف اٹھا سکتا ہے - اگر مرثیہ کو شاعری سے جدا سمجھا جائے تو اردو شاعری
بہت ہلکی معلوم ہوتی ہے - فخر شعرائے ہند میر انیس مرحوم کو فصاحت - بلاغت -
شستگی زبان کی پاکیزگی خیالات - متانت سنجیدگی بیان - انوکھی طرز ادا - دلکش

الفاظ سیدھی سادی ترکیبوں۔ ٹھوری ہوئی بندشوں کے لحاظ سے اور بزرگانہ فی
نیز ذاتی واقفیت اور عمدہ مشوروں کی دلچسپ تشبیہوں کے لحاظ سے دنیا کے
مشہور شعرا میں بلند مرتبہ حاصل ہے۔

ہندستان کے مسلمانوں اور اُن اقوام کے جن کو اس زبان سے تعلق
ہے تنزل اسباب میں سے اگر غور کیا جائے تو ایک بڑا سبب شاعری معلوم
ہوگی۔ یہ تو ایک مسلم بات ہے کہ ہمارے شعراء دنیا کے کسی کام کے بھی نہیں گویا
ان کا وجود ہی عبث ہے۔ مگر میری رائے میں وہ محض ناکارہ نہیں ہیں۔ شاید
وہ ہمارے تنزل کو ترقی دینے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اس میں ان کو
پوری کامیابی ہوئی۔ اِدھر جراتی کا بھوت سر پر چڑھا اور اُدھر ہماری ساری جنون خیز
لٹریچر پر دسترس ہونے سے نوجوانوں کے خیالات میں وقتی شورش پیدا ہوگئی۔
اُن کے اخلاق اور دماغ کو ملکی اور تمدنی حالات کو سخت صدمے پہنچے
ان کے قوائے طبعی کو اس درجہ بدلی کہ وہ لفظ انسان کے مفہوم سے خارج
ہوگئے۔ اخلاق اور دماغ کو جو نقصانات پہنچے جن کا ذکر میں مضمون ہٰذا کے
اخیر میں کرچکا ہوں۔ چونکہ ہماری شاعری کی بنا خیالی جھوٹے عشقیہ مضامین پر
ہے۔ اس سبب سے اخلاقی قوتیں اور ذہنی قوائے بہت ہی کمزور ہوگئے۔ اور یہ
کمزوری دنیا کے کاروبار میں بہت حارج ہوئی۔

ہمارے ملک کی حکومت خدا جانے کیسی قوم کو دی ہے جسکے اکثر افراد حکیم۔
فلسفہ دان۔ مورخ۔ طبیعات کے موجد حقائق پسند ہیں۔ اور انکی عمدہ زبان
اُن کے خیالات کا آئینہ جب یہ ملک ان لوگوں کے تصرف میں آیا اُن کی زبان
رموز سلطنت کے سمجھنے کا ذریعہ اور کسب معاش کا وسیلہ ٹھہری۔ ملک میں نئی
قسم کی تعلیم جاری ہوئی۔ اب تواریخ۔ جغرافیہ۔ ریاضی۔ فلسفہ۔ منطق۔ طبیعات
کے درس ہونے لگے۔ یہ خواہش تو ہمارے دل میں کاہے کو ہونے لگی۔ کہ
رموز سلطنت کے سمجھنے کی قابلیت پیدا کریں اور مشیر دولت بننے کی غرض سے

مشتغل ہو ہم کیا اصرار کرتے ہیں۔ مگر کسب معاش نے ان علوم کی طرف رجوع
کرنے پر مجبور کیا۔ طبیعت کو کیا کرتے پڑھتے تھے تو ناز و بیت سر پر آتی۔ تعلیم پاتے
فراق کے عاشقانہ اشعار یاد ہیں۔ مضامین نہ سمجھے۔ فلسفے منطق پڑھتے ہوئے اشعار
زلف کی تعریف یا کمر کا ذکر کرتے ایک حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ ہم غور کر ان کے
مضامین کی جوہر یاد کرتا ہیں۔ جیسے تاریخی حالات۔ طب کے لٹریچر سے بیہودہ جغرافیہ
کے نام ریاضی کے اصول۔ فلسفے کے مسائل۔ طبیعات کی ناکارہ باتیں تاریخ
جغرافیہ کو تو خیر رٹ بھی لیں مگر ان مضامین کے سمجھنے کو دماغ کہاں سے لائیں دماغ
ایسے مخصوص ہوئے طبیعتیں ایسی نارسا ہوئیں کہ بجائے سید احمد خاں کو مضمون
لکھنے پڑے۔ یہ ساری آفتیں اس شاعری کی بدولت نازل ہوئیں اس کا
اندازہ وہ شخص کر سکتا ہے جسکو انگریزی پڑھنے کا کام اس وقت پڑا ہو جبکہ اس
کمبخت شاعری کا رنگ اس کی طبیعت پر چڑھ چکا ہو۔

جب ہم عقل کو کھو بیٹھے ہر قسم کی تعلیم سے عموماً اور انگریزی تعلیم سے خصوصاً
محروم ہو گئے تو ملکی خدمات لینے بھی ہم سے کنارہ کیا۔ ملکی خدمات سے محروم
ہوا تو افلاس نے گھیرا۔ افلاس میں گھرے تو بغض حسد کینہ نفاق اور
تمام کینہ خیالات پیدا ہو گئے۔ اب آئے دن کی لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ ایک
کو دیکھ کر ایک جلنے لگا۔ ممنوعات شرعی کا اس زور شور سے رواج ہوا کہ شیاطین
بھی ہماری سوسائٹی سے پناہ مانگنے لگے۔ ان ساری مصیبتوں کے اور بھی اسباب
ہوں گے مگر شاعری کا بھی ان میں بہت بڑا حصہ ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ بعض بزرگوں کے شور و غل نے لوگوں کو خوابِ غفلت سے
چونکایا ہے۔ اور انہوں نے اپنی اولاد کو سیدھے راستہ پر لگانا شروع کیا ہے
یقین ہے کہ اگر وہ ایسا کرتے گئے تو کچھ عرصہ کے بعد قوم کی حالت سنبھل جائے گی
خدا قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں سچا مذاق پیدا کرے اور ان کو شاعری
کے پھندے سے محفوظ رکھے۔

ہے شاعروں کو گویوں کی طرح طمع سے کام — اگر کہیں گے ثنا بھی تو اس میں ہوگی ریا

سبب یہ ہے کہ ہوا جہل آ کے عالمگیر — کیا دلوں کو تعصب نے مبتلائے بلا

صفائی قلب سے کوسوں الگ ہوا نیت — ہر ایک ہو گیا کبر و نفاق کا پتلا

بس انتہا ہے یہ اس کی کہ غیر تو ہیں غیر — جو دیکھئے تو مخالف ہے باپ سے بیٹا

خدا کرے کہ مری قوم سے ہو دفع یہ بات — کسی طرح نہ رہے شاعروں میں کبر و ریا

یہ اپنی رائے ہے ظاہر کیا جسے وشد — کسی پہ جرح سے مطلب نہیں نہیں بخدا

یہی خیال ہے چالیس سال سے دل میں
اگرچہ سن ہے مجاوز شعور شعر کجا

سخن فہمی اور معنی فہمی

ادب کی آرایش کے آراستہ اور مکمل باغ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس میں ہر قسم کے درخت موجود ہوں۔ درختوں میں کئی قسم کے درخت ہوتے ہیں ایک وہ جو گھانس کی طرح اُگتے ہیں۔ دوسرے وہ جن میں پھول ہی پھول ہوتے ہیں پھل نہیں ہوتے۔ تیسرے وہ جو پھل دیتے ہیں۔ پھول نہیں دیتے۔ چوتھے وہ جن میں پھول بھی ہوتے ہیں اور پھل بھی لگتے ہیں۔ پانچویں وہ جو پھل اور پھول دونو سے خالی ہیں۔ پھر اُن کے پھلوں اور پھولوں کی تاثیر اور اُنکی ذات و صفات کے خواص دیکھے جاتے ہیں۔ بعض درختوں کے پھول رنگین ہیں مگر خوشبو ندارد۔ بعض میں خوشبو ہے مگر رنگینی نہیں۔ بعض رنگ اور خوشبو دونوں رکھتے ہیں۔ بعض درختوں کے جسموں سے خوشبو آتی ہے۔ بعض کریہ الرایحہ ہیں بعض نفع رساں ہیں۔ بعض مضرت بخش۔ بعض کے افعال و خواص معمولی ہیں۔ بعض کے حالات کو سوائے حکیم اور طبیب یا ماہر علم نباتات کے ہر شخص نہیں جان سکتا۔ اور اُن کے خواص بطور اسرار کے اُن میں موجود ہیں وہی حال ادب کا ہے۔ اور شاعری اس باغ کی بہار ہے اور جیسے پھل پھول کا دیکھنا ایک بات اور

اُن کے لطائف کا احساس دوسری بات ہے - ویسے ہی شاعری کے لفظوں کو دیکھنا ایک بات اور اُن کے معنوی لطائف کا احساس دوسری بات ہے -
یہ بہت ہی نازک خیال ہے جسکو بیان کر رہا ہوں ؎

بلبل نے بھی یہ نغمۂ رنگیں سُنے نہیں
دامن میں ہیں وُہ گل جو کسی نے چنے نہیں

ایشیائی شاعری کے باکمال اساتذہ نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ سخن گوئی سے سخن فہمی زیادہ مشکل اور بہت زیادہ مشکل ہے - لیکن یہ ایسا فیصلہ ہے جس سے اس اجمال کی تفصیل نہیں ہوتی - اور سخن گوئی اور سخن فہمی اور معنی فہمی کے مقاصد علیحٰدہ علیحٰدہ نظر نہیں آتے - اسکی مثال ایک پھول اور اس پھول کے ظاہری رنگ اور خوشبو اور اس رنگ اور خوشبو کے احساس لطائف سے ہے یا ایک پھل اور اس پھل کی ظاہری صورت اور اندرونی مٹھاس یا ذائقہ کے دوسرے مذاق پر مرتب کیجا سکتی ہے - میں نے اردو کی کسی کتاب اور فارسی کے کسی رسالہ میں اس موشگافی کی توضیح و تشریح نہیں دیکھی - لیکن عربی کا انداز بیان اور بھاشا کا طرز خرام اس مقصد پر ایک حد تک کامیاب ہونے کا راستہ بتاتا ہے - اردو مذاق سے بھاشا کا مذاق بہت قریب ہے - اس لیئے مجھکو اس مقام کی دلربائی کے لئے اصنام ہندی کا احسان اُٹھائے بغیر چارہ نہیں ؎

بُت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

شاعری کو اپنے دیکھنے والے کی ہمیشہ تلاش رہتی ہے - اور جیسے حسن اپنی دلبری اور دلداری کے نیرنجات دکھانے سے خوش ہوتا ہے ویسے ہی شاعری تہ در تہ پردوں کے اندر اپنے ادائے حسن کی جلوہ ریزیوں کا تماشہ دکھانا چاہتی ہے - اور جب وُہ داد پا لیتی ہے تو بے انتہا خوش ہوتی ہے اور ناآشنائے

کے پاس جانے سے زیادہ اُسکو کوئی تکلیف نہیں۔ چنانچہ میرزا صائب کو بے موقع داد ملنے اور مناسب موقع داد نہ ملنے دونوں حالتوں میں ایسی تکلیف ہوتی تھی کہ اُن سے اظہار شکایت کئے بغیر نہ رہا گیا وہ کہتے ہیں ؎

صائب دو چیز مے شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس

شاعری چند سانچوں کے ذریعہ سے اپنا سر نکالتی ہے ایک سانچہ وزن کا ہے کہ اس میں جو موزون الفاظ بھردو وہ شعر بناتا چلا جائے گا۔ دوسرے لفظوں کا سانچہ جسمیں موزونیت کلام سے طرح طرح کے الفاظ سانچے میں ڈھالے جاتے ہیں۔ چوتھے وہ جو الفاظ و معانی دونوں کو موزون طبعی سے ڈھالتے ہیں کمل مشین کا کام دیتا ہے۔ لفظوں کے متعلق معنوی کیفیات اور لطائف کے سمجھنے کو ہر زبان میں کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ مغربی مذاق بھی ناٹک تھیٹر ڈراما میں ایک ایک لفظ کی صورت دکھانے اور اُسکے معنے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ پارسی قدیم میں یہ کام ایران کے مختلف معابد اور پیکدوں میں مذہبی ڈرامہ کے خیالات کے ساتھ بڑی دلچسپی سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور سنسکرت اور بھاشا میں بھی مذہب اور موسیقی کے ساتھ اس کو شریک کردیا گیا ہے۔ تاکہ اس سے عام دلچسپی کو ترقی رہے۔ اس کو بھاشا میں ارتھ و نرت کہتے ہیں۔ اور اس کا مقصد لفظوں کے معنے سمجھانا اور آنکھ کے اشارات اور جسم اعضاء کے حرکات اور اُنکی مختلف اداؤں سے طرح طرح کی قریب الفہم صورتوں کے پیدا اور معنوی حقایق کے ظاہر کرنے کا ہے۔ لیکن جیسے بیشتر موسیقی کا علم حکمت میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ بوعلی سینا جیسا شخص موسیقی نہ جاننے سے حکیم کے درجہ میں شمار نہ کیا گیا اور صرف شیخ الرئیس کے خطاب سے مخاطب ہوئے مگر اب موسیقی سب سے انتہا ذلیل ڈوم ڈھاڑیوں کے مانگ کھانے کا ذریعہ بن رہا ہے اور اب ایشیائی دنیا میں موسیقی سی حکمت کے خاص معانی و مبانی کو ٹکا ئی نہیں ہے

ہی ارتھ وشیشت جو پہلے ہندستان میں رائج تھا ان کے دربار اور اعلیٰ محفلوں کے ترتیب مذاق کا ایک ضروری متوسط سلیقہ ہو چکے اور اشعر کے ہر وجہ اور مقام کے آداب و آداب اور اس کے وجہ اور مقام کے فنونوں کے معنوی دقائق و حقائق سمجھے اور سمجھائے جاتے تھے وہ بھی چند بازاری رسمیوں اور کتھکوں کے گھروں میں باقی رہ گئے ہیں۔ جس سے وہ دیکھنے والوں کے دلوں کو لبھاتے اور رجھاتے ہیں اور ان کا نقشہ اتنا بگڑ گیا ہے کہ اُن کو اصل سے کچھ مناسبت نہیں لیکن اب بھی ان کے بگڑے ہوئے نشانات ایک عجیب علم اور لاثانی بناوٹ کا پتا دیتے ہیں۔ اور اُن سے ایک مسمریزم کا سا اثر پیدا ہوتا ہے ؎

ع جس کی پیری ہے اس کا شباب کیا ہوگا

اردو کا شاعر شعر کہتا ہے تو اپنے دل میں ایک یا دو معنی خیال کرتا یا قرار دیتا ہے لیکن یہ ارتھ اور شیشت کرنے والے کبھی جو اب برائے نام ہندوستان میں باقی ہیں۔ ایک ایک لفظ سے اُسکے متعدد معنے اور لطائف معنوی کا مینہ برسا دیتے ہیں۔ جس سے لطائفِ معنوی کی ایک وسیع دنیا علاحدہ آباد نظر آتی ہے جو بغیر اُس تفنن کے نظر نہیں آ سکتی۔ مثلاً ایک شخص نے گایا۔ آئی بہار۔ اسکے معنی کیا ہیں بہار آمد اور شاعر کے دل میں معمولی اور عام طور سے بہار کا مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔ یہی کہ پھولوں پر ایک طرح کا حسن مزید پیدا ہو گیا۔ مگر اُس نے ارتھ اور شیشت کے ذریعہ سے بہار آئی کے ان گنتی نمونے سامنے حاضر کر دئے جس سے ایک شاعر اپنے مذاق کی اصلاح کر سکتا ہے اور ایک حکیم اُن کے اسباب و علل کے جولانگاہ میں ہکا بکا ہو سکتا ہے اسکا مختصر چربہ یہ ہے۔

(۱) بہار آئی جوانی کی اور اس میں جو جو بناؤ اور اٹکھیلیاں ہوئیں اور جو اُمنگیں ظاہر ہوتی ہیں۔

(۲) بہار آئی حسن کی۔ اور اس کی نوعیت الہی تیری پناہ۔

(۳) بہار آئی بارش کی۔ جاڑے کی۔ گرمی کی۔

(۴) بہار آئی موسم بہار کی۔

(۵) بہار آئی پھلواری کی۔

(۶) بہار آئی فصلی چڑیوں کی۔ کوئل بولی۔ کلّہ پھوٹا۔ درخت بڑھا۔ مور آیا آم لگے۔ پانی برسا۔ آم ٹپکے۔

(۷) بہار آئی ... کی۔ مع لوازم وغیرہ وغیرہ۔

یا کسی شعر میں وصال و فراق کا اشارہ ہو۔ یا رخصتِ جاناں کا ذکر ہو یا تو ایک ایک لفظ کے مفہومات معنوی کی توضیح دیکھئے جو ... سے تعلق رکھتی ہے اور جو خاص بھاشا کے مذاق سے متعلق ہے۔ اس کی نہایت اونچی زیادہ زور دلچسپ ہے اور وہ ہماری شاعری کے سرسری افہام سے دور اور بہت دور سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی نور اللہ مرقدہ نے علاوہ اپنی مسلم الثبوت اور بے مثل شاعری کے ایک اردو لغات جمع کی ہے۔ اسکی پہلی جلد میں آنکھ کے متعلقات کا ذکر کیا ہے۔ جیسے آنکھ آنا۔ آنکھ اٹھنا۔ آنکھ بیٹھنا۔ آنکھ دکھانا۔ آنکھ پھڑکنا وغیرہ۔ یہاں آپ آنکھ پھڑکنے کے لفظوں کو دیکھیں کہ کس زبان سے اردو میں آئے ہیں تو آپ بہت جلد سمجھ جائیں گے کہ ان کے معانی اور مبانی کا سراغ بھاشا تک پہنچتا ہے۔ لیکن جب ہم ایک محققانہ غور سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ آنکھ پھڑکنے کی سب نوعیتوں کو دریافت کرنے کے لئے کسی کی چشم گویا سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ اور یہ سبق جب ہی مل سکے گا جب آپ کسی اہل اور مہارت کرنے والے سے یہ تقریر نہ سنیں ؎

موری اکھیاں پھڑکن لاگیں

کیونکہ بھاشا کے مذاق میں آنکھ کا پھڑکنا کئی معنی رکھتا ہے اور ہر معنے کو مختلف لطائف کے ساتھ وابستگی ہے۔ داہنی آنکھ پھڑکنے کے معنی کچھ ہیں۔ بائیں آنکھ پھڑکنے کے معنی کچھ۔ ایک آنکھ چھ جگہ سے پھڑکتی ہے۔ پس دونوں آنکھیں بارہ جگہ سے پھڑک سکتی ہیں اور ہر مقام سے پھڑکنے کی ایک خاص تعبیر ہے کہ فلاں

جگہ سے آنکھ پھڑکی تو اُس کا یہ اثر یا مقصد سمجھنا چاہیئے۔ پھر عاشق اور معشوق اور عورت و مرد کی آنکھوں کی پھڑکن جُدا جُدا مذاق ظاہر کرتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مقام کیسا دلچسپ اور معنی خیز ہے اور اُسکے ساتھ اُس کی معلومات کے ذرائع کتنے کمیاب ہیں۔

اقسامِ سخن

سرسری طور پر واقف ہونے کے لئے اس بات کا جاننا ضرور ہے کہ شاعری میں اقسام سخن کے لئے کیا کیا نام مقرر ہیں یا کس کلام کو اصطلاحی طور سے کیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے میں مختصر طور سے اُن کا ذکر کرتا ہوں اور ایک شاعر اقسام سخن پر قادر ہوئے بغیر استاد دبستان نہیں مانا جا سکتا۔ اور نہ ماننا چاہیئے اب اقسام سخن ملاحظہ ہوں۔

مصرع

مصرع ایک شعر کے دو مساوی حصّوں میں سے آدھے حصّہ کا نام ہے خواہ دونوں حصّے ردیف و قافیہ برابر رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن دونوں کے وزن کا برابر ہونا ضرور ہے۔ مثلاً استاد ذوق کا شعر ہے ؎

نگاہ پھیر کے عذرِ وصال کرتے ہیں مصرع

مجھے وہ الٹی چھری سے حلال کرتے ہیں مصرع

اس کا ہر حصّہ ایک مصرع ہے اور بغیر ردیف و قافیہ کی مثال یہ ہے ؎

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز

اُسی خانہ خراب کی ہے

مطلع اُس کو کہتے ہیں جو تحقیق میں سب سے پہلا شعر ہوتا ہے۔ اور مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ کا التزام کیا جاتا ہے۔ پھر اگر مثنوی کا مطلع

ہے - تو آیندہ شعروں میں اختیار رہتا ہے کہ جس شعر میں چاہیں دوسرے قافیہ اور ردیف کے الفاظ لائیں اور ہر شعر میں ردیف و قافیہ بدلتے جائیں یا صرف قافیہ اختیار کریں - لیکن غزل قصیدہ قطعہ میں اُسی قافیہ کے ہم قافیہ لفظ لانا اور اگر قافیہ کے ساتھ ردیف ہو تو ردیف کا قائم رکھنا ضرور ہے - مثال

مثال مطلع و اشعار مثنوی

مطلع ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری (قافیہ بلا ردیف)		ثمرہ ہے قلم کا حمد باری (قافیہ بلا ردیف)
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر		حمد حق و مدحت پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے (قافیہ، ردیف)
یعنی کہ مطیع پنجتن ہے (قافیہ، ردیف)

اس مثنوی کے پہلے اور دوسرے شعر میں قافیہ بلا ردیف ہے اور تیسرے شعر میں ردیف بھی لائی گئی ہے - اسیطرح اختیار ہے کہ جس شعر میں چاہیں صرف قافیہ کا التزام کریں اور جس شعر میں چاہیں قافیہ کے ساتھ ردیف کو بھی لائیں -

مثال مطلع و اشعار

غزل

مطلع فدائے حسن یوسف کارواں ہے (قافیہ، ردیف)		جدھر تم ہو ادھر سارا جہاں ہے (ردیف)
کسی پر عمر بھر مرتے رہے ہم		نہ سمجھے کون ہے کیا ہے کہاں ہے (قافیہ، ردیف)
پڑے جھگڑے ہیں دل کا درد کہکر		وہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھیں کہاں ہے (قافیہ، ردیف)
میں اب سمجھا کہ ہے کیا شے قیامت		ترا قصہ ہے میری داستاں ہے (قافیہ، ردیف)

ہجوم آرزو نے ساتھ چھوڑا
یہ دل اب یوسف بے کارواں ہے (قافیہ، ردیف)

اس غزل کے مطلع میں قافیہ اور ردیف دونوں ہیں اس لیے سب شعروں میں قافیہ اور ردیف کا التزام ضروری ہوا۔ اسی پر قطعہ اور قصیدہ کا خیال کر لیا جائے۔ اور اگر مطلع میں صرف قافیہ ہو اور ردیف نہ ہو تو صرف قافیہ کی رعایت کی جائے گی۔ جیسے استاد ذوق کا قطعہ ہے۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

بڑے بیٹھا تھا پڑا نام علما کے اپنے تھا تصوّر میرا ہر امر میں تدقیقِ صفت

قافیہ اور ردیف

قافیہ مناسب باترتیب اور موزون لفظوں کو اشعار میں ایک کے پیچھے ایک (قفا بقفا) لانے سے مراد ہے جو شاعر کو اور اس کے مطلب میں بہت بڑی مدد دیتا ہے۔ وہ شعر کو محدود اور مقید کر کے منضبط کرتا ہے۔ ہمارے شاعر قافیہ کے شکنجوں پر چلنا اور اس کی داد لینا شاعری کے رستہ کا ایک خاص نشان بتایا جاتا ہے۔ عربی فارسی اُردو بھاشا کے قوافی میں بہت بڑا بیّن فرق ہے۔ عربی کے اکثر قوافی فارسی اور اُردو میں صحیح نہیں مانے جاتے۔ ایسا ہی بھاشا کے اکثر قافیوں کو اُردو کی شاعری تسلیم نہیں کرتی۔ قوافی کی نسبت اساتذہ کلام میں خاص خاص بحثیں ہو چکی ہیں مرزا دبیر لکھنوی نے عربی کے مشہور ادیب مفتی میر عباس صاحب کے ایک قافیہ اُردو پر تامل کیا تھا۔ یعنے مفتی صاحب نے میرا کا قافیہ طٰہٰ لکھا تھا۔ آخر کو مفتی صاحب نے مان لیا ہے کہ میرے خیال پر عربی کا ادب متصرّف ہے۔ اسلئے مجھکو اُردو میں اُردو کے مسلّمات کا خیال نہ رہا۔ اسیطرح شیخ امام بخش صاحب صہبائی نے بعض قوافی پر جرح کی ہے۔ اور مولانا فضل حق خیرآبادی اور منشی اسمعیل منیر شکوہ آبادی سے اچھا خاصہ مناظرہ ہو پڑا تھا اور خود اُردو میں بھی قوافی کی صحیح اور غلط جائز و ناجائز مستحسن وغیرہ صورتیں ہیں جنکے علم عروض و قافیہ کی کتابوں میں بیان کر دیا

دیگر

تمہاری بزم کچھ ایسی ہی تھی نشاط افزا — رقیب نے بھی اگر پی مجھے سرور آیا
تری گلی میں رہی بازگشت مثل نفس — میں جتنی دور گیا واپس اتنی دور آیا

دیگر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں میں

دیگر

حرم و دیر میں ہے جلوۂ پرفن اس کا — دو گھروں کا ہے چراغ اک رخ روشن اس کا

دیگر

ہجوم شوق میں جب دل کی آرزو نکلے — جو پردہ کعبہ کا لوٹوں تو ہاں بھی تو نکلے
تمہیں تو ناز تھے نواب پارسائی پہ — تمہارے گھر سے تو مے کے کئی سبو نکلے

رُباعی

رباعی چار مصرعوں کی نظم ہے۔ رباعی کے اوزان بہت ہیں۔ اور بعض حالتوں میں چاروں مصرعوں کے اوزان میں جائز تفاوت ہوتا ہے مگر وہ موزون تفاوت کسی مصرع کو پڑھنے میں سامع کے ادراک کو اپنی ثقیلی اور گرانی سے ناخوش نہیں کرتا۔ رباعی میں بڑے بڑے مطالب چار مصرعوں میں سما جاتے ہیں۔ رباعی ایک ایسا سانچہ ہے جو اعلیٰ درجہ کے معنی خیز مقاصد کو اپنے آپ میں اپنی خاص ترکیب و ترتیب سے جگہ دیتا اور تھوڑے لفظوں میں بہت مطالب کے ادا ہونے کی گنجائش رکھتا ہے۔ پہلے عربی اور فارسی میں رباعیات کا بہت بڑا چرچا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے مطالب کو رباعیات کے ذریعہ سے ادا کیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ مطالب آسانی سے یاد رہ سکیں اور فاضل مصنف کا قابل قدر یادگار رہیں۔ ازانجملہ عمر خیام کی رباعیاں ایسی مشہور و مقبول ہوئیں جن کا شہرہ شہرت

ایشیا بلکہ یورپ میں بھی پایا جاتا ہے۔ لنڈن میں ایک خاص کلب عمر خیام کلب کے نام سے مقرر ہے۔ اور انگریزی میں تین شرحیں لکھی گئی ہیں۔ جنپر مسلمان خصوصیت سے اظہار شکر گذاری کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ مذاق کی مغایرت نے انگلش قدردانوں کو شاعری کے اصلی دقایق اور فلسفہ کے حقیقی حقایق کے سمجھنے کا بہت تھوڑا موقع دیا ہے۔ کاش نئے تعلیم یافتہ اہل کمال میں کوئی گریجوایٹ اُن رباعیات کی صحیح شرح کرکے انگلش سوسایٹی کو تحفہ بھیجے تو اپنا ایک خاص فرض ادا کرنے والا ہوگا۔ راقم نے فارسی کی سیکڑوں رباعیات کو ایک جگہ جمع کیا ہے جسکو شاعری کی کان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں رباعیات کو عام شاعری میں جگہ نہیں ملی اور بہت اچھا ہوا۔ جو شاعری کا یہہ حصہ عمومیت سے بچا رہا۔ اور رباعی کی ترکیب و ترتیب اور اُس کا مذاق بھی افہام عوام سے دوُر ہے۔ اس لئے اکثر اعلٰے درجہ کے ارباب کمال اور اُدبا نے کلام نے رباعیات کو اظہار کمال کا ذریعہ بنایا۔ جیسے میرانیس۔ میرزا دبیر۔ یا خاص خاص شعرا اور رباعی کا چوتھا مصرع من حیث لطافت و بلاغت مضمون نہایت بلند ہوتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ و مثال چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

رباعی

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو ۔۔۔ آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگ جاں سے ہے اسپر یہ بُعد ۔۔۔ اللہ اللہ کسقدر دور ہے تو

رباعی

یہ عشرت و عیش و کامرانی کب تک ۔۔۔ عشرت بھی ہوئی تو نوجوانی کبتک
گر یہ بھی ہی بقائے دولت ہے محال
دولت بھی ہوئی تو زندگانی کبتک

سے مراد ہے اور کسی شعر یا پوری غزل اور قصیدے کا مثلث بنانا شعر سے پہلے ایک نئے مصرع کا اضافہ کرنا ہے جو مناسبت مقام اور اپنی موزونیت کلام سے اُس شعر کے ساتھ مطابقت کلی رکھتا ہو۔ اور شعر کی معنوی خوبیوں میں ایک لطیف ترقی اور حسن پیدا کا اضافہ کرتا ہو۔ جیسے میر انیس کا شعر ہے

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

ہم نے اس پر مصرع لگا دیا تو یوں مثلث بن گیا۔

ہو گئی میری شہادت جو نظر آئی مرے لئے   خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

مخمس

عربی میں خمس پانچ کو کہتے ہیں اور اصطلاحِ سخن میں مخمس بند کے پانچ مصرعوں سے مراد ہے۔ اور کسی شعر یا پوری غزل اور قصیدہ کو مخمس بنانا ہر شعر سے پہلے تین نئے مصرعوں کا اضافہ کرنا ہے جو ہر اعتبار سے اُس شعر کے ساتھ مناسبت اور مطابقت رکھتے ہوں۔ اور پڑھنے والے کو معلوم ہو کہ اصل شعر پر جو مصرعے لگائے گئے ہیں۔ اُن کی اُس شعر کو ضرورت تھی۔ اور مصرعوں کے لگانے سے اُس شعر کی تفصیل اور معنوی خوبیوں میں ایک لطیف اضافہ ہو گیا ہے۔ گویا مثلث میں دو مصرعوں کا اضافہ ہوا ہے۔ مخمس کو خمسہ بھی کہتے ہیں۔

تضمین۔ مضمون کی توسیع و ترقی کے لئے جو اشعار ضمن کلام میں لائے جائیں اُن کو اصطلاحِ سخن میں تضمین کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر یا پوری غزل اور قصیدہ پر ہم نے مصرعے لگا کر مخمس کیا تو سمجھا جائے گا کہ ہم نے اُس شعر یا غزل یا قصیدہ کی تضمین کی۔ تضمین میں وہی اوصاف ہونا چاہئیں جو مثلث اور مخمس کے ذکر میں مذکور ہو چکے۔

مسدس

مسدس چھ مصرع یا تین شعر سے مرکب ہے۔ پہلے دو شعر یا چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اور اگر ردیف ہے تو وہ بھی لازم ہوتی ہے۔ پھر تیسرا شعر یا دو مصرعے اپنا قافیہ و ردیف علیحدہ رکھتے ہیں۔ اُردو میں سب سے زیادہ شاعری نے مسدس کی شکل میں اظہار کمال کیا ہے۔ میر انیس اور میرزا دبیر اور دوسرے مرثیہ گویان لکھنؤ کے نہایت قابل قدر کمال کا ذخیرہ مسدس کی شان میں ہے۔ اور نئی روشنی کے مجتہد الشعراء مولانا الطاف حسین حالی کی سب سے زیادہ مشہور و مقبول تصنیف بھی مسدس کی صورت میں ہے۔ اور اکثر شعرائے اردو نے اپنے اپنے واسوخت بھی مسدس کی شکل میں لکھے ہیں۔ اور مسدس ہے بھی ایسی چیز کہ اس میں نہ تو شاعر کو تلاش قوافی کی زیادہ دقت ہوتی ہے اور نہ ایک مطلب کے ادا کرنے کو تین شعر کا ایک بند ناکافی ہوتا ہے۔ اور مسدس کے پڑھنے میں ادائے بیان کو مناسب سکون و توقف کے حدود ملتے جاتے ہیں جو پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کے لئے خوش آیند ہیں۔ راقم نے ترانۂ معرفت نام ایک مسدس لکھا۔ اُس کے دو بند بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں ؎

کلید گنج حکمت رازِ عرفانِ الٰہی ہے ۔۔۔ گدا کو اسکے کوچے کے تو بید پادشاہی ہے
ہر اک ذرہ کو اُسکے رتبہ خورشید ماہی ہے ۔۔۔ جہاں میں اُسکو شایاں منصب عالم پناہی ہے
سپہ ہے نقشِ شاہی قل ہو اللہ احد اُس کا
چلے توحید کا سکہ ازل سے تا ابد اُس کا

زمانے سے تماشا میں سمے زمیں تیری نشاں تیرا ۔۔۔ فلک تیرے ملک تیری بشر تیری جہاں تیرا
سمک سے تا سماء صانع کون و مکاں تیرا ۔۔۔ سریر عرش تیرا فرش تیرا لامکاں تیرا
ابد سے تا ازل تو ہے ازل سے تا ابد تو ہے
خدایا سارے عالم میں احد تو ہے صمد تو ہے

قطعہ

ایک بڑا مضمون جو ٹکڑے ٹکڑے (قطعہ قطعہ) کرکے مسلسل ترتیب سے اشعار میں لایا جائے۔ تو اُن اشعار کو قطعہ کہیں گے قطعے میں مطلع ہونا لازم نہیں اور نہ اُس کا ہونا ممنوع ہے قطعہ دو شعر سے کم نہیں ہوتا۔ اور زیادہ کے لئے کوئی حصر نہیں کیا گیا لیکن زیادہ اشعار کا لانا خوشگوار نہیں۔

قطعہ گل و بلبل

میں علی گڈھ میں آج جا نکلا　　　تھے فلک سے برس رہے انوار

قبرِ سیّد پہ دیکھتا کیا ہوں　　　ہے گلوں کا لگا ہوا انبار

جمع ہیں بلبلانِ نغمہ سرا　　　ہیں وہ کالج سے بر سرِ پیکار

حالی۔ حالی کی آ رہی ہے صدا　　　شبلی شبلی کی پڑ رہی ہے پکار

دیکھ کر مجھکو گل نے مجھ سے کہا　　　اے سخندانِ ریختہ گفتار

گل و بلبل کا یہ مقدمہ ہے　　　یہ نہیں جنگِ زاغ و بوتیمار

ہے نباتات میں شرف مجھکو　　　میں ہوں روحِ روانِ باغیچہ

مے سے کھنچتی رہی سدا میری (شراب)　　　وہ رہی غافل اور میں ہشیار

ہے عنادل کو مجھ سے وابستگی　　　مجھ پہ سو جان سے شیفتہ ہیں ہزار

میں عرب کا حبیبِ ہمدم ہوں　　　میں عجم کا ہوں مونسِ غمخوار

آئے خوشبو میرے پسینے سے　　　میں محبت میں ہوں سیّدِ سردار

پوچھ لیجے مجھے طبیبوں سے　　　میں ہوں درمانِ عاشقِ بیمار

میں محبت میں جوانِ رعنا ہوں　　　میں ہوں اک شاہزادہ کہسار

میں صحیفہ ہوں رازِ نیچر کا　　　مجھ میں پوشیدہ سینکڑوں اسرار

جب یہ مدحت سرائے اصل ادب　　　مجھکو دیکھا کہ میں ہوں حال کار

کو قطعہ بند کہیں گے اگرچہ وہ مثنوی کے شعر ہوں۔ چنانچہ پچھلا قطعہ قطعہ ہے اور قطعہ بند بھی۔ لیکن یہاں ایک دوسرا قطعہ قطعہ بند حالتوں کے دکھانے کو لکھا جاتا ہے ۵

قطعہ قطعہ بند

صبح کا تھا وقت چلتی تھی نسیم جانفزا
میں سوادِ شہر سے باہر ہوا کھانے گیا

جھومتے تھے ڈالیوں پر پھول کس انداز سے
جیسے جھولا جھولتے ہوں مہوشانِ دلربا

نور کا تڑکا سحر کا وقت کھلتی کونپلیں
تتلیاں اُڑ اُڑ کے دکھلاتیں عجائباتِ خدا

آ رہی تھی بھینی بھینی بوئے خوش ہر سمت سے
چل رہی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہر طرف بادِ صبا

رستہ پر ایک شے مجھکو پڑی آئی نظر
صبح کے ہمرنگ تھی وہ مایۂ شاہ و گدا

وہ وہ کہ صورت سپید اور سخت پتھر کی طرح
شیر ماہی کی طرح اجلی مجلّا باصفا

جسم تھا سارا مشبک سینکڑوں سوراخ تھے
ہوتی تھیں پیدا صدائیں سی جب بھرتی ہوا

خوش فضا سیلن میں آتی تھی نظر وہ اس طرح
جوں حسیں دکھلاتے کوئی خندۂ دنداں نما

نام کو تھا جسم پر اسکے نہ پیراہن کوئی
لیکہ سارا جسم تھا اک نورِ مطلق سے ڈھکا

دیکھ کر محوِ تحیر مجھکو اس نے بات کی
یوں زبانِ حال سے گویا ہوئی وہ عشوہ زا

ہمقصد و ہمقصا و قالب دیدہ ام اندر جہاں
مولوی روم کا ہے بود با من آشنا

قرنہا شد با غزالی چشم الفت داشتم
عمرہا با سعدی و حافظ نشستم بر ملا

کیا کہوں میں ہنسی والی کس محل کی تھی کبھی
جو محل معمار قدرت نے بنایا تھا مرا

خاک کی پتلی مری تا صور کو اچھا کرے
پاتے ہیں کمر و جوہر سے میری علم شفا

مجھکو پردوں میں چھپا دستِ قدرت نے مگر
رنگ و روغن پھوٹ کر اجسام سے نکلا مرا

میری جوہر سے نسب کو فخر تھا اقوام میں
میری گوہر سے ہوا کرتی تھی نطفوں میں جلا

مجھ سے پڑھتے ہیں جیالوجسٹ دنیا کو سبق
دے قدامت کا پتہ میری زمینِ خیتوا

عقل دارا کِ صحیحہ کے لئے معیار ہوں
ہوں فزیالوجی والوں کے لئے میں رہنما

تھی میں ہستا خوان یعنی خانۂ ہستی کبھی
اب دیا ہے استخوان ترکیب لفظی نے بنا

اب ذرا سنئے کیا ہے ... مجھے ہوں میں اک بڑی برائی کیا کہوں سکو ...
اب ... ہیں ... ہیں آشہری
... جہاں ... کی تھا

مثنوی

مثنوی میں ہر چیز کی تشریح وصفت کی جاتی اور ہر طرح کے واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثنوی کے ہر شعر میں نیا قافیہ اختیار کیا جاتا ہے یا ردیف و قافیہ دونوں نئے ہوتے ہیں جنکی رعایت صرف اسی شعر کے دو مصرعوں میں کی جاتی ہے۔ فارسی میں شاہنامہ سکندرنامہ یوسف زلیخا اور اردو میں گلزار نسیم اور میر حسن کی مثنوی اور طلسم الفت مثنوی کا نمونہ ہیں ــه آشہری

مثال مثنوی

ہوں شاہ جہاں سے میں سخن ساز
اردو سے ہے مری نسیم شیراز

سوکھے ہوئے پھول اس چمن کے
گلدستے ہیں اہل انجمن کے

ہر دل ہے میرے کلام سے شاد
اقلیم سخن ہے مجھ سے آباد

خامہ علم و نشاں ہے میرا
کاغذ کا ورق جہاں ہے میرا

ناظم ہیں کلام کے مقالے
ہیں فوج کی جا میرے رسالے

ہر دشت ہے شاہراہ میری
ہر شعر ہے تخت گاہ میری

دیہیم عجم ہے تاج میرا
ہے داد سخن خراج میرا

غزل

غزل کے معنی سخن با محبوب گفتن کے ہیں۔ یعنی معشوق سے بات کرنا

اس لئے ایک غزل میں جداگانہ معنی کے اشعار لانے کا اصول اختیار کیا گیا
ہے۔ کسی شعر میں عاشق اپنے جذبات باطنی کا اظہار کرتا ہے جس سے معشوق
متاثر ہو کسی شعر میں معشوق کی تعریف کرتا ہے جس سے وہ خوش ہو کر اس کی جانب متوجہ
ہو۔ کہیں حبیب کی احسان مندی کا اعتراف ہوتا ہے۔ اور کہیں رقیب کی شکایت
کا اظہار بہرحال جو واقعات معشوق کی خلوت اور جلوت میں پیش آتے یا پیش آسکتے
ہیں۔ یا جو بات عاشق کو کہنا اچھی معلوم ہوتی ہے اور جسے معشوق کے خوش
ہونے یا اور کسی خاص نتیجہ کے پیدا ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے وہ غزل
کے اشعار میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اور کہیں شاعری کے ذریعہ سے حسن مضمون
کا دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ اور کہیں پند و حکمت اور پند و موعظت کے
مضمون بھی اشعار غزل میں لائے جاتے ہیں۔ جن کو شاعر کسی مفید اثر پڑنے
کے لئے قلمبند کرتا ہے۔

شاعری کا مقصد اصل غزل کو خاص طور سے حسن و عشق کے راز و نیاز اور
عاشق و معشوق کے مطالب میں صرف کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور نیز دور اول
میں غزلیات کو موسیقی کے ذریعہ سے عاشق و معشوق کے خلوت و جلوت
میں باریابی اور کاربرآری کا خاص ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ خسرو پرویز
اور شیریں کے حالات اور واقعات اور دونوں کی بزم آرائی اور بارید اور نکیسا
کی مطربانہ نغمہ سنجی اور غزلیات کے ذریعہ سے دونوں کے سوال و جواب اس بات
کا پتا دیتے ہیں کہ دور اول میں غزل کو خاص طور سے اس کام میں لایا جاتا تھا۔

اُردو کی دنیا میں صرف غزل کے چند ذرائع ہیں ایک مشاعرہ جس میں شعراء
جمع ہو کر اپنی غزل پڑھتے اور داد سخن سے دل خوش کرتے ہیں۔ دوسرے
وہ گلدستے جو مخصوص غزلیات کی اشاعت کو شائع ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ
کہ اس زمانہ کے گانے والوں نے چند غزلیں یاد کر لیں اور ہر مجلس میں گا گا کر
امیر غریب عاشق معشوق سب کو رجھا لیا۔ چوتھے سوال اور جواب کا

طریق جو سب سے پہلے لکھنؤ میں امانت نے اندر سبھا میں ایجاد کیا۔ اور واجد علیشاہ کے رہس میں اس نے جگہ پائی اور اب انگریزی ناٹک تھیٹر کی وضع میں جا بجا وہی طریق دوسرے معمولی لباس میں نظر آتا ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ شاعری میں غزلیات کا حصہ بازاری کسبیوں اور گویوں کے سبب سے زندہ ہے اور عام غزل گوئی کو چند گلدستوں نے زبردستی چلا رکھا ہے۔ اردو کی غزل گوئی پر فارسی مذاق کا پورا پورا اثر پڑا ہے۔ بھاشا میں عورت کا عشق مرد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ عرب میں مرد کا عورت پر۔ فارسی میں مرد کا امرد پر۔ مگر فارسی میں عورت مرد دونوں کے لئے ایک صیغہ بولا جاتا ہے اور اردو میں عورت مرد کے لئے مذکر اور مونث کے دو صیغے ہیں اور اردو کا معشوق مذکر ہے۔ اگرچہ عورت ہو۔ ؎

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا
امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

غزل کی مثال

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں ۔۔۔ کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں
پا کے اُن کو بڑھ گئی ہے اور بھی کچھ آرزو ۔۔۔ کل تھے کیا کہنے کو ہم اور آج کیا کہنے کو ہیں
ہوشیاری پختہ کاری اُن سے کوئی سیکھ جائے ۔۔۔ نا سمجھ تو ہیں مگر وہ نام خدا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ ۔۔۔ برہمن کیا ہم اسے بے شک خدا کہنے کو ہیں
ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل ۔۔۔ جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

غزل پانچ شعر سے کم اور اکیس شعر سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ اور زیادہ کہنے والوں کے لئے کوئی قید نہیں

تشبیب

تشبیب کے معنے ہیں ذکر شباب کردن۔ یعنی شباب کے دنوں کا ذکر کرنا۔ اور وہ اقسام

تناسب سے تعلق ہے جیسے جوانی۔ بہار حسن وغیرہ۔ اگر شاعری میں صرف انکے شباب کا ذکر کیا جائے تو اس کو تشبیب کہیں گے۔ جیسے اکثر قصائد میں دیکھا ہوگا کہ پہلے کسی قسم کی تشبیب کا بیان کیا تاکہ سامعین کے قلوب میں تازگی اور شگفتگی کا اثر پیدا ہو اُسکے بعد اُسے گریز کرکے مدح ممدوح کیجانب کلام کا رُخ پھیرا۔ یا مرثیوں میں پہلے تشبیب بیان کی۔ پھر بزم آرائی اور رزم پر متوجہ ہوئے جس سے سامعین کے دلوں پر درجہ بدرجہ ہر قسم کے اثر پڑتے جائیں۔ اور اگر صرف تشبیب لکھنا مقصود ہے تو تشبیب لکھکر کلام کو تمام کردیا۔

قصیدہ

اقسام شاعری میں قصیدہ کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ قصیدہ میں شاعر کے اوج خیال کا انتہائے کمال اور اُس کی فکر کا منتہائے عروج دیکھا جاتا ہے اور جیسے غزل کہنے کے لئے عشق کے لوازم اور حسن کے مراتب سے واقف ہونا فرض ہے۔ ویسے ہی قصیدہ کے لئے بادشاہی دربار اور آداب سلطنت سے واقف ہونا واجب ہے تاکہ وہ ہر لفظ اُس درجہ کے مناسب لاسکے اور اُسکی کوئی بات وابٔ آداب کے خلاف نہ ہونے پائے۔ فارسی میں خاقانی اور قاآنی کے قصائد لاثانی ہیں۔ اور اُردو میں سودا۔ ذوق۔ مومن۔ نسیم دہلوی۔ میرزا غالب۔ امیر مینائی۔ منیر شکوہ آبادی کے قصائد کا ایک جگہ جمع ہونا اور بغور دمعنی فہمی سے اُنکا مطالعہ کرنا بڑے بڑے افادات کلام کا ذریعہ ہوسکتا ہے اور اس سے اردو کے مناسب حال اُردو کے ادب اور شاعری کی ایک خاص رہنمائی ہوسکتی ہے

ترکیب بند

ایک قطعہ میں اپنا مطلب لکھنا۔ اور چند شعر ہم قافیہ وردیف کے بعد ایک شعر اُس سارے قطعہ کے اتمام مقصد کو دوسرے قافیہ وردیف کا لانا۔ اور پھر دوسرا

بند شروع کرنا اور اُسی طرح چند شعر کے بعد ایک شعر لانا۔ اس کو ترکیب بند کہتے ہیں۔

ترجیع بند

ایک قطعہ میں اپنا مطلب بیان کرنا اور پھر کسی خاص شعر کیجانب جسکے معنی اس مقصد سے ملتے ہوں رجوع کرنا اور اس التزام کو آخر نظم تک قائم رکھنا ترجیع بند کی اجمالی تعریف ہے اور بند کے بعد جو شعر لایا جاوے وہ عرف عام میں خاص شہرت اور قبولیت رکھتا ہو تو زیادہ لُطف کی بات ہے۔

مرثیہ

مرثیہ کے معنی مردہ کی تعریف کرنیکے ہیں اور پہلے اردو میں کہا جاتا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ لیکن میر انیس اور میرزا دبیر اور ان کے دوسرے باکمال مرثیہ گوؤں نے واقعہ کربلا کی رزم و بزم سے نہ صرف اس مشہور مثل کو غلط ثابت کیا بلکہ اقسام شاعری کو مرثیہ اور سلام اور رباعیات میں دکھا گئے۔ اور مرثیہ گوئی کے فن کو ایک ایسا علم بنا گئے جو اعلےٰ درجہ کے شاعر بھی اُن کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ خلیق۔ ضمیر۔ انیس۔ دبیر۔ مونس۔ اُنس۔ نفیس۔ سلیس۔ وحید۔ عشق۔ فصیح کے مرثیوں اور سلاموں اور رباعیوں کا جمع ہو جانا اردو کی شاعری کے لئے فصاحت و بلاغت کا معدن اور نہایت قابل قدر معلومات کا خاص ذریعہ ہے۔ اور مرثیوں کی شاعری کو رواں پڑھنے سے موزون طبعی کا خاص نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ جو طبیعت کو آپ ہی آپ موزون کر لیتا ہے۔ جیسے شاہنامہ پڑھنے سے ایک روانی پیدا ہوتی ہے۔ مرثئے اکثر بلکہ سب کے سب مسدس کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ گویا یہ وضع مرثیوں کے لئے مخصوص ہو گئی ہے اور مرثیوں سے نیچرل شاعری اور رزم و بزم کی واقعہ نگاری کا لاثانی اقتباس کیا جا سکتا ہے۔

سلام

جیسے تہنیت کے جلسوں میں غزل کا کام ہے ویسے ہی ائمہ علیہم السلام کی مجالس عزا میں سلام بغزل کا قائم مقام ہے مرثیہ گویان لکھنؤ نے شاعری کا جو کمال سلاموں میں دکھایا وہ بہتوں سے غزلیات میں نہ دکھایا گیا۔ سلام میں مطلع اور اشعار اور مقطع مثل غزل کے لائے جاتے ہیں اور جو مضمون زیادہ بیان کرنا ہوتا ہے تو اشعار کو قطعہ بند کیا جاتا ہے۔

واسوخت

واسوخت میں عاشق کی طرف سے جلی کٹی باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی عاشق اپنے پچھلے زمانہ اور معشوق کی مہربانی کو یاد کرتا ہے۔ اور کبھی اپنی موجودہ حالتوں اور معشوق کی نامہربانیوں کی شکایت کرتا ہے۔ کبھی معشوق کے دلپر اثر کرنے والے فقرے تراشتا ہے کبھی رقیب کی شکایتوں کا ذکر کرتا ہے۔ وغیرہ علیٰ ہذا القیاس

آجکل واسوخت کا چرچا کم ہے۔ اور اچھا ہے جو اس طرف سے بے خبری ہے۔ پچھلی تصنیفات میں اکثر شعراء کے واسوخت دو جلدوں میں مطبع اودھ اخبار سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور شعلۂ جوالہ اس مطبوعہ مجموعہ کا نام ہے۔ اُس میں واسوخت امانت۔ واسوخت سحر۔ واسوخت رعنا اپنے اپنے مذاق میں خاص قسم کے ہیں۔

شعرائے مشاہیر

میری عمر پچاس سال سے متجاوز ہے میں ۱۳۲۱ ہجری مطابق ۱۹۰۴ء میں کتاب لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی عمر میں جن شعراء کو دیکھا یا سُنا یا انکی ہم بزمی کا اتفاق ہوا یا جن نے اپنی عمر کے طبقہ اعلیٰ کے افراد میں پایا ان کے نامی اسمائے گرامی سے اس کتاب کو عزت دیتا ہوں ان میں سب سے اول اُردو کے

فردوسی میر انیس کا نام لیتا ہوں ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

میر انیس غفر اللہ تعالیٰ

بلبل سے بھی یہ نغمۂ رنگیں سُنے نہیں
دامن میں ہیں وہ گل جو کسی نے چُنے نہیں

میر انیس فیض آباد کے رہنے والے ہیں۔ خلیق کو میر صاحب کی اُستادی کا فخر حاصل ہے میر حسن دہلوی میر صاحب کے حقیقی دادا ہوتے ہیں جن کی مشہور مثنوی اردو مثنویات میں اب تک آپ ہی اپنا نظیر سمجھی جاتی ہے مغربی مذاق بھی ان کے ڈرامائی ترکیب اور اُن کی سادہ و پرکار شاعری کو پسند کرتا ہے۔ اپنی ذیتہ حالتوں سے اُس مثنوی نے ناٹک تھیٹر میں بھی جگہ پائی ہے۔ اور ہندوستانی مذاق میں تو اُس نے عام دلچسپی اور دلفریبی حاصل کی ہے۔ میر انیس عنفوان شباب میں فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے۔ اُس زمانہ میں لکھنؤ بھی شباب پر تھا اور شیعہ مذہب کی سلطنت اور حکمرانی نے محرم کے دنوں میں بڑی ترقی ظاہر کر رکھی تھی۔ اِس لئے میر صاحب نے مرثیہ گوئی میں اظہارِ کمال شروع کیا۔ اور ممبر پر بیٹھے رہی قبولیت، دست بستہ سامنے کھڑی ہوئی۔ اور خدا نے حسنِ کلام کیسا تھ حسنِ بیان کا حصّہ بھی میر صاحب کے لئے علاحدہ کر دیا۔ لکھنؤ جیسے شہر میں میر صاحب کا فروغ پاتا اُن کے لاثانی کمال کی مکمل شہادت ہے۔ اور تمام ہندوستان میں کوئی نہیں جو میر صاحب کے لاثانی کمال کا معترف اور معتقد نہ ہو۔ فردوسی نے شاہنامہ میں مختلف لڑائیوں کا حال لکھا ہے جو شاہانہ سامانِ جنگ سے برپا ہوئیں اور میر صاحب نے کربلا کی ایک مختصر اور محدود جنگ میں معجز بیانی کا وہ کمال دکھایا ہے جسکو فردوسی بھی حیرت زدہ ہو کر دیکھ سکتا ہے۔ اور میر صاحب کی تصنیف

اشعار دو لاکھ شعر سے زیادہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو فردوسی کی تعداد تصنیف سے کہیں زیادہ ہے۔ اردو کو اس امر کی خاص ضرورت ہے کہ میر صاحب کی سوانح عمری بڑی تحقیق و تدقیق سے لکھی جائے اور عربی اور فارسی کے ابتدا تکلم سے اس زمانہ تک کا مواد جمع کیا جائے۔ اور ایک ایک تصنیف کے مقابلہ میں میر صاحب کی تصنیف کو دکھایا جائے۔ مولانا شبلی صاحب نعمانی نے آنریبل خلیفہ محمد حسن خاں صاحب مرحوم وزیر پٹیالہ کی اعانت سے اس قسم کا مواد جمع کیا تھا۔ اور مجھ سے فرماتے تھے کہ اگر میں میر صاحب کی سوانح عمری لکھنے کو تیار ہوں تو وہ مواد مجھ کو عنایت کر دیں گے۔ لیکن میں خود کو اس قابل نہیں پاتا اور اگر اپنی عزت سمجھ کر اس کام پر آمادہ ہوں تو برس دو برس اس کام میں مصروف رہنے کا اطمینان نہیں۔ اور بغیر ایک خاص کوشش اور محنت اور وسیع تحقیق و تدقیق کے میر صاحب کی تاریخ لکھنا نہ لکھنا برابر ہو۔ اسے خدا تو کسی فرد کامل کو اس ضروری کام کی توفیق دے اور انہیں ہمت دے۔ میر صاحب کا کلام مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے چھپوایا ہے۔ تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ لیکن ابھی بہت بڑا حصہ شائع ہونے سے باقی ہے۔ کاش کوئی شخص میر صاحب کی رباعیات، سلام، مراثی کو فراہم کر سکے۔ جامعہ شاندار کتاب مرتب کرے اور اس کی تدوین خاص اہتمام سے کی جائے تو ایک بہت بڑا فرض ادا کرنے والا ہو سکتا ہے۔

میں نے میر انیس غفران مآب کو دو مرتبہ دیکھا اور ان کی زبان سے مجلس میں ان کا یہ مرثیہ سنا ہے ؏

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں انیس سے زیادہ کسی کو فصیح البیان پایا ہو۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ میر انیس کے تحت لفظ پڑھنے میں ان کی خوش بیانی وہ لطف پیدا کرتی تھیں جو صرف ان کا حصہ مانا جاتا ہے۔ ہر سال عظیم آباد میں محرم کی مجلسیں پڑھنے تشریف لے جاتے تھے ہزاروں آدمی جمع ہوتے تھے

سے ملتا تھا ایک مرتبہ سالار جنگ نے حیدرآباد میں طلب کیا تھا۔ وہاں تیرہ روز رہے۔ سر سالار جنگ نے تیرہ ہزار پیشکش کئے۔ اور سر آسمان جاہ بہادر نے چاہا کہ میر صاحب میر ٹوپی پہنکر بیٹھنے کی جگہ حیدرآباد کی منصبداری پگڑی رکھکر بیٹھیں تو ایک مجلس کے دس ہزار پیشکش کئے جا سکتے ہیں مگر میر صاحب نے کہا کہ میں اہلبیتؑ کے دربار میں جس وضع سے حاضر ہوتا ہوں اُس کے خلاف گوارا نہیں کر سکتا اور آخرکار دس ہزار چھوڑ دیے مگر اپنی ٹوپی کا منصبداری پگڑی کے عوض میں سر سے اُتارنا قبول نہ کیا۔

قطعہ

ملا انیس سے میں لکھنؤ میں ہوں دوبار — انیس وہ جو خدا نے سخن میں بھیجے کار
انیس کا نہیں اردو زباں میں مثل کوئی — لٹا گئے وہ معانی کے گوہر شہوار
کلام انکا جواب کلام قدسی — بیان اُن کا بیانِ کلیم خوش گفتار
براق بن کے نکلتا انیس کا گھوڑا — جوابِ صاعقہ دیکھی انیس کی تلوار
لکھی جو صبح تو کاغذ پہ روشنی پھیلی — لکھی جو شام تو گیسوئے حور تھے اشعار
کہیں جو صورتِ وادیٔ کربلا کو رقم — تو اسکے سامنے تھے گردِ گلشنِ گلزار
دکھائی باغ کے نشو و نما کی گر حالت — تڑپنے لگ گئی صحنِ چمن میں فصلِ بہار
تمام طرزِ بیاں سہل ممتنع اُن کا — جو تھا انیس کو آساں وہ غیر کو دشوار
زبان کوثر و تسنیم سے دھلی انکی — دہانِ صدف گوہر بیان لولوبار
تھیں شاہ اودھ (واجد علیشاہ) کے سلام کرنے کو — کھلا تھا اُن کے لئے اہلبیت کا دربار
طبیعت انکی ہمہ دانی میں ابر نیساں تھی — برستے اُس سے ہمیشہ تھے گوہر شہوار
خدا گواہ کبھی یہ فصاحتیں نہ سنیں — بڑے کبھی نہ ہوا فصیح خوش گفتار
بلاغتوں کے لگے ڈھیر ہر طرف آ کے — فصاحتوں کے لگے اُن کے سامنے انبار
انیس اُن کا تخلص ببر علی تھا نام — نہ لکھنؤ کے شرف بلکہ تھے وہ فخر دیار

میں اُن کی کثرتِ تصنیف کو بتاؤں کیا
سنا عزیزوں سے ہیں انکے ڈیڑھ لاکھ اشعار

کیا انیس نے احسان زبانِ اُردو پر
انیس ہی وادیٔ اُردو کو کر گئے گلزار

رباعیوں میں بھری ہیں بلاغتیں کیا کیا
سلاموں میں نظر آئی مثنوی کی بہار

جو نکتے چاہیے سلاموں سے چھان سکتے ہیں
غزل کے رنگ قصیدہ کے طرز کے اشعار

ہر ایک صنفِ سخن پر انیس قادر تھے
وہ ایک رنگ میں کھلا گئے چمن کی بہار

حسین ابنِ علی کو بلا ہے جو وہ حال
کہ جس سے بلبلِ سدرہ کی بند ہو منقار

وہ دیکھو گھوڑے سے لشکر کی آمد آمد کو
وہ دیکھیے آتا ہے کس شان سے علم بردار

وہ گھوڑے ٹاپوں سے کس طرح روندتے ہیں زمیں
وہ دیکھو چلتی ہے کس کس بناؤ سے تلوار

وہ باندھتے ہیں کس شکوہ سے عماری
وہ کیسی ہلتی ہے شیروں کی ڈونک سے کچھار

ہیں شاہنامہ میں صدہا لڑائیاں لیکن
کیا انیس نے اک جنگِ مختصر کو ہزار

ہزار طرح سے لکھا ہے اک لڑائی کو
ہزار طرح سے کھینچی انیس نے تلوار

ہزار طرح سے باندھا ہے ایک مضموں کو
ہزار طرح سے دوڑائے توسنِ رہوار

وہ جھلکتے ہیں کہیں گر سبو و ساغر پر
تو پھر ہے سرد ظہوری کی گرمیٔ بازار

وہ فنِ مرثیہ گوئی کو علم کر کے گئے
ہیں اپنے حجتِ قاطع انیس کے اشعار

ملے وہ مبدءِ فیاض سے انہیں مضمون
جو اہلِ بیت کے ہیں خاص قابلِ دربار

دبیر اُن کے مقابل ہوئے سخن آرا
بڑے شکوہ سے دکھلائی ہیبتِ گفتار

مگر انیس کو فردوسیٔ سخن پایا
دبیر مثلِ نظامی ہوئے مرصع نگار

انیس مہرِ سپہرِ کمالِ فنِ سخن
دبیر ماہِ کمالِ سپہرِ عزّ و وقار

شعاعِ مہر کلامِ نفیس سے پیدا
کلامِ ماہ درج شبِ مہ کی طرح پُر انوار

بڑے بڑے علما اُن کے قائلِ معنی (طرزدار انیس)
بڑے بڑے ادبا اُن کے ناقلِ گفتار (شگفتہ طرز دبیر)

بڑے بڑے فصحا اُن کے قائلِ تفسیر
بڑے بڑے بلغا اُن کے واصفِ اشعار

کہا مجھ سے مکرر جنابِ شبلی نے
کہ میں انیس کی لائف لکھوں برسمِ کبار

مگر زمانہ نے فرصت نہ دی کہ لکھ سکتا
ہوں اب بھی تنگیٔ فرصت سے [illegible]

میر انس اور میر مونس میر انیس کے حقیقی بھائی ہوتے ہیں - اور دونوں مرثیہ گوئی میں مختر خاندان ہیں - میر نفیس میر انیس کے بیٹے ہیں جو مرثیہ خوانی میں اپنے ناموَر باپ سے بہت کچھ شابہ پاتے گئے اور زمانہ نے میر انیس کے بعد ان کی بھی بڑی ہی قدر کی۔ پران کے سزاوار تھی۔ اور میر وحید میر انس کے بیٹے ہیں جو اپنے خاندان میں نانا کی طبیعت لیکر آئے تھے لیکن اب ان صاحبوں میں سے کوئی باقی نہیں راقم نے ان سب کو دیکھا اور سب کی مصاحبت نوازی سے مستفیض ہوا ہوں خصوصاً میر نفیس کو لکھنؤ اور حیدرآباد میں بھی یہ کہہ سنا ہے جہاں سنّی شیعہ ہندو مسلمان علما و امرا بار صرف ان کے اشتیاق میں جمع ہوتے تھے - اور بڑے بڑے عالی وجیہ امیر انکی جانب ہمہ تن محو نظر آتے تھے -

میرزا دبیر

لکھنؤ میں میرزا دبیر میر انیس کے فاضل ہمعصر اور مرثیہ گوئی میں قابل مقابل تھے میر انیس کو اردو کا فردوسی کہیں تو میرزا دبیر کو اردو کا خاقانی کہنے میں کچھ تامل نہ کرنا چاہئے - میرزا دبیر نے مرثیہ کہا اہل بیت اطہار کے جوش تولا سے اختیار کیا وہ ایک سید کے احترام میں ایسی فروتنی ظاہر کرتے تھے جو اس زمانہ میں کمیاب ہے میرزا صاحب کو عربی کے ادب اور عقاید کی کتابوں سے خاص دلچسپی تھی اور فارسی کی اعلیٰ تصنیفات بھی ہمیشہ زیر نگاہ رہتی تھیں اس لئے عربی اور فارسی کی ترکیبات اور شکوہ کلام سے ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کی آمد اور آورد کو جگہ ملی تھی وہ اردو کے لفظوں میں عربی اور فارسی کے بڑے بڑے مطالب لانا چاہتے تھے اور اسی لئے ان کو بعض جگہ تعقید کی پرواہ نہ ہوتی تھی - کیونکہ وہ تعقید کے بچاؤ سے ایک اعلیٰ مضمون کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے - میرزا دبیر کے کلام سے بلا انتہا اعلیٰ مطالب کا اقتباس کیا جا سکتا ہے - میرزا صاحب کی تصنیف کا صحیح شمار معلوم نہیں مگر میر انیس کے ساتھ ساتھ ان کو بھی دیکھنا چاہیے -

میرزا دبیر کے کچھ مراثی اور سلام اور رباعیات میں سے تین جلدیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں۔ کاش تمام کلام ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو اردو کی شاعری کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ راقم کو بزمانہ قیام لکھنؤ اکثر میرزا صاحب سے حصول نیاز کا موقع ملا ہے۔ میرزا دبیر کا انتقال میر انیس کے بعد ہوا۔

امیر مینائی

کہتے ہیں کہ زمانہ مشکل سے سو برس میں ایک ذی کمال پیدا کر سکتا ہے۔ جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی بھی انہیں ذی کمال افراد میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ منشی صاحب منشی مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد رشید ہیں۔ طبیعت کا اصلی مذاق صوفیانہ تھا۔ نواب کلب علیخاں بہادر فرمانروائے رامپور خلد آشیاں نے تمام ہندوستان سے منتخب کر کے منشی صاحب کو اپنا استاد بنایا تھا۔ اور آخر وقت تک وہ منشی صاحب کو اپنے دربار کی عزت سمجھتے رہے۔ میں نے حضرت منشی صاحب کو رامپور اور بھوپال میں دیکھا اور آخر میں اس قدسی ہیکل کی حیدرآباد میں زیارت کی ہے ایک زمانہ میں خطوط کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

منشی صاحب کا کلام غزل قصیدہ دونوں میں ان کا کمال ظاہر کرتا ہے۔ تین دیوان منشی صاحب کے چھپ چکے ہیں۔ ان میں ایک دیوان نعت جناب سرور کائنات میں ہے۔ اردو کی دنیا میں کسی کا کلام نعت اس مرتبہ کا نہیں۔ شاعری کے علاوہ منشی صاحب نے ایک لغات اردو کی تدوین میں اپنی وسعت معلومات کا اظہار کیا۔ جو حصہ لغت کا چھپ کر شائع ہو چکا وہ آپ ہی اپنا نظیر سمجھا جاتا ہے اور انگلستان کی علمی سوسائٹی میں بھی اسکو قبولیت خاص کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ مسٹر آدبرن نے جن کی کئی نشتیں ہندوستان کی خدمات میں گذریں۔ اپنی عالمانہ تحقیقات ہند کے متعلق اپنی تصنیف میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی اور ان کی قابل قدر امیر اللغات کا ذکر کیا ہے۔ مسٹر برن یہ بات چاہتے ہیں کہ یہ لغات مکمل

چھپ جائے اور اس نظر سے وہ یہ رائے دیتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو و نواب صاحب بہادر رامپور کو جن کی فیاضانہ امداد سے اس کتاب کا آغاز کیا گیا تھا ان خدمات اس کام کے واسطے تفویض کرے وہ کہتے ہیں کہ نہایت افسوس کا مقام ہوگا کہ باقیماندہ کتاب نہ چھپ سکے۔ (دیکھو انسٹیٹیوٹ گزٹ علیگڑھ ۵ جون ۱۹۱۲ء)

آخر سنہ ۱۹۰۰ء میں منشی صاحب کا انتقال حیدرآباد دکن میں ہوا۔ ان دنوں راقم بھی حیدرآباد میں مقیم تھا۔ غالباً حضور نظام نے منشی صاحب کو حیدرآباد آنے کا ایما فرمایا تھا۔

جب منشی صاحب بھوپال پہنچے۔ تو بعض عوارض کی شکایت تھی۔ جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ سابق بھوپال نے چار ہزار روپیہ پیشکش کئے اور چند روز اپنے آراستہ باغ میں مہمان رکھا۔ اور فرمایا کہ آپ یہیں رہیں کہیں نہ جائیں۔ مگر موت کی کشش کا روکنے والا کون تھا۔ آخر کار حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اور حضور کے ایما سے جناب داغ کے مہمان ہوئے اور چند روز بعارضہ پیچش مبتلا رہ کر انتقال فرمایا۔ منشی صاحب کے تلامذہ میں جلیل اور ریاض اپنے استاد کا قابل قدر یادگار ہیں۔ حضرت جلیل حیدرآباد میں ہیں اور جناب ریاض وہیں ریاض الاخبار کے اڈیٹر اور مالک۔

اوج

میرزا دبیر لکھنوی خاقانی اردو کے فرزند رشید میرزا اوج سلمہ اللہ تعالےٰ مرثیہ گوئی میں اپنے مشہور باپ کے نامور بیٹے ہیں۔ میرزا اوج کے کلام میں متانت وہی ہے۔ جو ان کو جناب دبیر مغفور سے وراثتاً پہونچی اور کلام کی بندش میں صفائی ان کی خاص ایجاد ہے۔ راقم نے حیدرآباد میں نواب فیاض علیخان صاحب کی آراستہ پیراستہ مجالس میں میرزا اوج کا کلام سنا۔ ان کے ہر بند پر صل علےٰ و سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے اور قریب قریب حیدرآباد کے تمام ہندو مسلمان امرا مجلس میں شریک ہوتے تھے

سڑک پہ عینکیں لگی گاڑی پر چڑھ فاتن کا مطلب سمجھا جاتا تھا۔

تسلیم

منشی امیر اللہ تسلیم سے رامپور میں ملا ہوں۔ اور جناب تسلیم کا کلام ان کی زبان سے سنا ہے اب سن شریف قریب ستر برس کے ہوگا۔ اردو میں صاحب دیوان ہیں۔ اور مثنوی شام غریباں آپ کے ادائے سخن کی بہترین نمونہ ہے۔ نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں۔

انوار حسین تسلیم

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کو فن تاریخگوئی میں ید طولےٰ حاصل تھا چنانچہ آپ نے اقسام تاریخ پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور یہ کتاب مطبع نیر اعظم مراد آباد میں چھاپی گئی ہے۔ میں نے لکھنؤ میں دیکھا تھا۔

جلال لکھنوی

لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ نواب کلب علیخاں فرمانروائے سابق رامپور کی قدر شناسی نے ان کو اپنے دربار میں جگہ دی تھی جناب داغ بھی ان کو مانتے ہیں۔ علم عروض میں دوسروں سے ممتاز ہیں۔ دیوان جلال چھپ گیا ہے کلام میں سلاست کے ساتھ متانت استادی کے درجہ میں لئے ہوئے ہے۔ راقم نے دیکھا نہیں کلام سے لطفِ سخن حاصل کیا ہے

فصیح الملک نواب مرزا خان داغ

جناب داغ کی تعریف مستغنی عن البیان ہے دوسرے حضور نظام حیدرآباد کی استادی اور پندرہ سو روپیہ ماہوار کی ملازمت نے اُن کو سب تعریفوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ جناب داغ کے تین دیوان ہیں اور سنتا ہوں کہ چوتھا

دیوان بھی نکل چکا ہے۔ لیکن جناب داغ کی شاعری کا دلچسپ اور بہترین نمونہ پہلا دیوان موسوم بہ گلزار داغ ہے۔ داغ کے کلام کی سادگی میں اداے کلام وہ مزہ دے جاتی ہے جو داغ اور صرف داغ کا حصہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ کا سلیس اور سادہ مذاق غزل کے لئے داغ کی زبان اور داغ کے انداز بیان کی نسبت خاص دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ اور اسباب میں داغ کو جو بات حاصل ہو گئی ہے وہ عام مذاق پر اثر ڈالنے والی ہے اور تمام ہندوستان کی محفلوں اور عیش و نشاط کے جلسوں میں جتنی غزلیں داغ کی گائی جاتی ہیں اور کسی کی نہیں گائی جاتیں۔

جناب داغ خواجہ ابراہیم ذوق کے شاگرد رشید ہیں۔ دلی سے نکلکر نواب کلب علیخاں فرمانروائے رامپور کی قدردانی سے دربار رامپور میں جگہ پائی اور نواب خلد آشیاں کے بعد تقدیر کی یاوری سے حیدرآباد پہنچکر حضور نظام کا استاد بنایا۔ جب جناب داغ حیدرآباد میں تشریف لے گئے ہیں تو راقم وہاں موجود تھا۔ اور خدا بخشے مولوی سیف الحق صاحب ادیب دہلوی نے مجھکو اُن سے ملایا تھا۔

مولانا حالی

مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی قصبہ پانی پت کے متوطن ہیں مگر ساری عمر دلی کی صحبتوں میں گذری۔ خواجہ ابراہیم ذوق۔ حکیم مومن خان۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ مفتی صدرالدین خان۔ نواب علاؤالدین خان رئیس لوہارو۔ میرزا اسداللہ خاں غالب جیسے ادبا و شعرائے کاملین کی ہم بزمی کا موقع پایا۔ مولانا حالی کی شاعری دو صورتوں پر منقسم ہے۔ ایک وہ جو اُن کے دیوان میں پائی جاتی ہے جو شاعری کا موضوع ہے۔ دوسرے وہ جسکو زمانہ کے مذاق اور اپنے زمانہ کی سخن فہمی کا اندازہ کرکے اُنہوں نے اختیار کیا۔

میں ادب کے مقام میں کچھ بولنا نہیں چاہتا۔ مگر مجھکو اپنی طبیعت اور اپنے ہواس کا اختیار ہے۔ میں اُن کے طرز قدیم کو شاعری جانتا ہوں۔ اور دوسرے طرز کو نظم اور صرف نظم۔ مولانا حالی کا دماغ من حیث شاعری کے اکثر دماغوں سے زیادہ روشن ہے۔ جسکے کمروں میں زمانہ شمع کافوری کی جگہ کیروسن آئل کی روشنی پسند کرتا ہے ؎

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھکر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

مولانا حالی کی تصنیف شریف اور تالیف لطیف سر سید احمد خاں کی لائف حیات جاوید۔ دیوان حالی۔ مسدس جزر و مد۔ یادگار غالب۔ حیات سعدی۔ اور متعدد نظمیں اردو کی دنیا میں بقائے زمان تک اپنی یادگار قایم رکھنے والی ہیں۔ راقم کو کئی مرتبہ مولانا سے حصول نیاز کا موقع ملا ہے اب سن شریف ساٹھ سال کے قریب ہوگا۔ مولانا حالی پرانی وضع کے ایک ایسے نیاز مند بزرگ ہیں جو علم ارثماطیقی میں نو کے ہندسہ کی طرح کبھی اپنی عزت کو نہیں چھوڑتے۔

نو	۹
نو دونی	۱۸ - آٹھ اور ایک نو
نو تیا	۲۷ - سات اور دو نو
نو چوکے	۳۶ - چھ اور تین نو
نو پنجے	۴۵ - پانچ اور چار نو

اسی طرح دس تک چلے جاؤ۔ ہر نتیجہ نو کو کم زیادہ کرتا ہوا نہ پاؤگے۔

ریاض خیرآبادی

منشی ریاض احمد صاحب ریاض خیر البلاد خیرآباد کے متوطن ہیں جس میں زمین

سے بڑے بڑے نامور عالم فاضل شاعر پیدا ہو چکے ہیں۔ اور ابھی تھوڑے
زمانے پہلے تک مولانا فضل حق اور ان کے بعد اُن کے نامور بیٹے مولانا عبد الحق
جیسے علامہ روشناس عالم تھے۔ شاعرانہ مذاق میں بھی خیرآباد کا نمبر بہت
بڑھا ہوا ہے۔ ریاض۔ مضطر۔ وسیم جیسے رنگین خیال اور کہاں نظر آتے ہیں۔
جناب ریاض حضرت امیر مینائی کے شاگرد رشید ہیں لیکن انداز بیان
میں فصیح الملک داغ کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ ریاض کی طبیعت غزل کے
حقیقی معنی سخن با محبوب گفتن کو خوب سمجھے ہوئے ہے۔ ریاض کی ترکیب۔
ادا بندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ داغ کی طرح بزم محبوب میں پوری رسائی
رکھتے ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک گذری ہوئی کیفیت کا نمونہ ہوتا ہے
ریاض کے استعارات کی رنگینی خاص قسم کی ہے۔ اور ریاض کی نثر میں بھی ایک
خاص رعنائی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ ان آوازوں پر کان لگائے رہتے ہیں
وہ ریاض کی نظم و نثر سنکر کہہ سکتے ہیں کہ ہو نہ ہو ریاض ہی کی آواز ہے۔

مضطر

جناب مضطر سے میرا تعارف نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ نواب ابراہیم علیخان
بہادر رئیس ٹونک کے ہواخواہ اور مصاحب خاص ہیں۔ اور اُن کا نہایت دلچسپ
اور دلپذیر اثر ڈالنے والا کلام مختلف گلدستوں میں دیکھا ہے۔ اور اس کلام سے
موضوعات شاعری کا قابل قدر پتا ملتا ہے جو اردو کی شاعری کا بہترین نمونہ سمجھا
جاسکتا ہے۔

شوکت

حسان الہند مولانا شوکت نزیل میرٹھ میدان مشاعرہ میں مرد اور اپنی طرز نگاری
اور بہتات خیال میں جوہر فرد ہیں۔ اخبار طوطی ہند اور شحنہ ہند اور رسالہ [illegible]
اُن کے مقالات شاعری کی جولانگاہ اور اُن کے خیالات رفیعہ کے جولانگاہ ہیں
ہمارے فاضل مخدوم نے متنبی خاقانی غالب کے اشعار کا جو حل کیا ہے وہ اردو کی

لا شبہ رمی میں بہت بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل ہے۔

منیر شکوہ آبادی

منشی اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی کی استاد اور علمی کو فاضلانہ درجہ حاصل ہے غدر سنہ ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں یہ بھی پکڑ کر کالے پانی کو بھیج دئے گئے تھے اور مولانا فضل حق خیرآبادی کو بھی وہاں بھیجا گیا تھا۔ مولانا فضل حق نے کہا کہ اردو میں عربی کی سی گنجایش نہیں اور عربی کا ایک قصیدہ پڑھا۔ منیر نے اسی کے جوڑ کا قصیدہ اردو میں لکھا جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔ نواب کلب علیخاں بہادر فرمانروائے رامپور کی قدردانیوں سے امیر۔ داغ۔ جلال۔ منیر شاعری کے اربعہ عناصر بن رہے تھے۔ منیر کی شاعری کا مذاق سب سے علیحدہ ہے۔ منیر کی شاعری سے ہندوستان کے خاص مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ منیر کی قدرت کلام کا اندازہ بغیر اسکے نہیں ہو سکتا کہ ان کے کلیات کو دیکھا جائے جو ایک مرتبہ چھپ کر کمیاب ہو رہا ہے۔ منیر انتہا کے خوش بیان تھے۔ ان کی باتوں میں عجیب دلربائی تھی۔ راقم نے منیر کو ان کی آخر عمر میں دیکھا ہے۔ جبکہ ان کا سن ساٹھ برس سے زیادہ ہو چکا تھا۔ مگر منیر کی شگفتہ مزاجی ان کو لڑکے جوان بوڑھوں میں یکساں بنائے رکھتی تھی۔

قلق

جناب آفتاب الدولہ قلق کو میں نے اسوقت میں دیکھا جبکہ وہ آفتاب لب بام ہو رہے تھے۔ قلق کا شمار لکھنؤ کے خاص شاعروں میں ہے اور قلق کا دیوان اور ان کی مثنوی طلسم الفت خاص دلچسپی سے دیکھی جاتی ہے اور اس سے زبان کے محاورات اور روزمرہ کی بول چال کا بہت کچھ پتا ملتا ہے۔

اسد اللہ خان غالب

مجھکو دلی کی آبادی اور شاعری کی دنیا میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیکھ لینا اسوقت سے دلی و سودا تک سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے

۱۲۸۵ھ ہجری میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائیکورٹ کے دیوانخانہ میں دیکھا اور ان کی شیوا بیانیوں سے بہرہ مستفیض ہوا۔ اسوقت میں میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والیہ سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر مرزا سے دلی چھٹنا مشکل تھا۔

میرزا غالب کا اردو دیوان شاعری کی جان ہے۔ اگر اردو میں شاعری کی صورت نظر آسکتی ہے تو میرزا غالب کے دیوان میں۔ مگر اس کا سمجھنا آسان بات نہیں۔ اسلئے مولانا شوکت کے حل غالب سے مشکلکشائی کا کام لینا چاہئے۔ میرزا غالب فارسی کے شاعر ہیں اور ان کا فارسی کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں استادانہ درجہ رکھتا ہے۔ مگر دلی کی بود و باش اور شاعری کے حقیقی مذاق نے اُن کی اردو شاعری پر جو اثر کیا وہ میرزا غالب ہی کا حصہ ہے۔ وہ اردو شاعری میں اپنی وضع کے آپ موجد ہیں اور آپ خاتم۔ حکیم مومن خاں اور استاد ذوق بھی اُن کے مشہور اور مستند ہمعصر ہیں۔ لیکن میرزا غالب کا کمال فن اور چیز ہے۔ ع

نسبت بخوباں میدہم لیکن تو چیزے دیگری

کلام الملوک

ابو ظفر

اردو کا تخم دلی سے ہے۔ شاہجہان کے وقت میں یہ بیج بویا گیا۔ محمد شاہ کے عہد میں نشو و نما پائی۔ ابوظفر خاتم سلطنت مغلیہ دہلی کے زمانہ میں پھول پتیوں کی کثرت ہوئی۔ اور دلی اور لکھنؤ کے زبان دانوں نے طرح طرح کے پھل پھول نمایاں کئے۔ یہاں تک کہ دلی کے آخری بادشاہ ابوظفر نے بھی شاعری

سے دلچسپی ظاہر کی۔ ظفر کا دیوان مشہور ہے اور اردو کی لائبریری میں ہونا ضرور ہے۔ شاہ موصوف ۱۸۵۷ء میں قید ہو کر رنگون کو تشریف لے گئے۔ اور وہیں رحلت فرمائی۔ میری عمر اس وقت میں آٹھ برس کی تھی۔ خواجہ ابراہیم ذوق۔ حکیم مومن خاں۔ مرزا غالب اس زمانہ کے خاص یادگار ہیں۔

واجد علی شاہ

حضرت جان عالم شاہ واجد علی شاہ اودھ کے آخری بادشاہ ہیں۔ موسیقی اور شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ حضرت کا ایک ضخیم دیوان بہت جلی خط میں چھپ چکا ہے۔ معزول کیا گیا ہے اور غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے کلکتہ کو جانا اور وہیں مٹیا برج میں قیام فرمانا پڑا۔ اور وہیں انتقال کیا۔ اختر تخلص فرماتے تھے۔ راقم نے بزمانہ حیات حضرت ممدوح مٹیا برج میں عمارت شاہی اور مسند چڑیا خانہ وغیرہ کی سیر کی ہے جسکو دنیا کا فردوس کہہ سکتے ہیں اور منشی امیر علیخان بہادر وزیر الدولہ ... نے حضرت کا دیوان مجھکو عنایت کیا تھا۔

نواب یوسف علیخان

طبقہ ابتدائیں اردو کا کلام نواب یوسف علیخان بہادر متخلص بہ ناظم فرمانروائے سابق رامپور کی متانت کلام اور امیرانہ خیال کو خاص طور سے ظاہر کرتا ہے۔ اور نواب صاحب ممدوح کو مرزا غالب سے خاص عقیدت تھی۔ نواب یوسف علیخان کا دیوان اس طبقہ کی تصنیفات میں اردو کا سرمایۂ تفاخر ہے۔

نواب کلب علی خان بہادر

رامپور کے دوسرے فرمانروا نواب کلب علیخان بہادر جن کا نام نامی اہل کمال کی قدردانی میں شہرۂ آفاق ہے۔ شاعری کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ اور امیر۔ داغ۔ جلال۔ منیر جیسے باکمال شعرا کی ہم بزمی نے ان کے مذاق پر اور صیقل کر دی تھی۔ نواب تخلص فرماتے تھے۔ نواب موصوف کی تصنیف سے کئی دیوان

یادگار ہیں۔ حضور ممدوح نے اپنی تمام تصنیف جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی
کے ذریعہ سے راقم چھپوا کر عنایت فرمائی تھی۔ جبکہ راقم بھوپال میں نائب ناظم
تھا۔ نواب موصوف الیہ کے دو دیوان ہیں جن سے اس وقت کی شوکت و دولت اور سعادت کی بول
چال اور شاعری کی ترکیبات بندش کا خاص پتا چلتا ہے۔۔۔۔

حضور آصف جاہ نواب میر محبوب علیخان نظام فرمانروائے ریاست حیدرآباد دکن

ماشاء اللہ چشم بد دور اعلیٰ حضرت قدر قدرت نظام الملک آصف جاہ نواب
میر محبوب علیخان بہادر فرمانروائے حیدرآباد دکن اردو زبان و فارسی کے بادشاہ ہیں
اردو میں اعلیٰ حضرت نے جناب داغ کو نواب فصیح الملک کا خطاب مرحمت کیا
اور بہت سے نوجوان نامور افتخار فرما چکے ہیں۔ جناب داغ اعلیٰ حضرت کے
استاد ہیں۔ حضور ممدوح کا کلام نہایت صاف اور پاکیزہ ہوتا ہے اور اکثر خیالات میں شاعرانہ
نفاست کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اور اعلیٰ حضرت کی نظروں سے رعایا کی نسبت
التفات کی حسن نیت نمایاں ہے جیسا ارشاد فرماتے ہیں۔ سے

آصف کو جان و مال سے ہرگز نہیں دریغ
گر کام آئے میری رعایا کے واسطے

اعلیٰ حضرت کے وزیر مہاراجہ کشن پرشاد صاحب بہادر شاد بھی نظم اور نثر میں مشہور ہیں۔ ان کی
اکثر غزلیات آپ کی تصنیف جناب داغ کے مقابلہ میں ایک ردیف و قافیہ پر شائع
ہوئی ہیں۔ اور خود حضور کے شاگرد ہیں اور اردو کی لائبریری کے لئے شاہ و وزیر
کے کلام بے نظام کا ایک ایک پرچہ جمع ہونا ضرور ہے۔ راقم نے باغ عامہ کے ایک شام
جلسہ میں حضور پُرنور کو گہرافشاں ہوتے دیکھا ہے اور جناب مہاراجہ کشن پرشاد
بہادر شاد کی شیوا بیانی سے بھی بزمانہ پیشکاری مسرور ہوا ہوں۔ جبکہ میرے
دوست مسٹر شاد ملازم ڈیوڑھی مہاراجہ پیشکار نے مجھکو یاد فرما کر اس کا موقع
دیا تھا۔

ناولسٹ

اردو کے ادب میں اثر ڈالنے کی وجہ سے مذاق ناول کو ذرا میں نظر نہ کرنا چاہیے
اگرچہ اسکے بعض خیالات کو میں پسند نہیں کرتا ہوں لیکن اُسکے انداز بیان اور
انشا پردازی کا لحاظ کرنا چاہیے کیونکہ زبان دانی سے اُن سے بہت سے نئے
فقرات کا اقتباس کیا جاسکتا ہے جس سے اُردو کو فائدہ پہنچنا معمولی بات نہیں ہے
اس موقع پر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام سب سے پہلے لیتا ہوں جنکے ناولوں میں مختلف
سوسائیٹیوں کے طرز بیان کا دلچسپ خاکا موجود ہے۔ دوسرے مولانا عبدالحلیم
صاحب شرر لکھنوی جن کے ناولوں میں دلچسپی کے ساتھ کلام کی متانت کا خاص
حصہ ہے تیسرے حکیم محمد علی صاحب جن کی لطافت طبعی اور حکیمانہ اور اُنکے
جعفر و عباسہ۔ اور جان و ہنوریا۔ اور دوسرے ناولوں میں قابل قدر نقاشی کی ہے
یا ایسے ہی اور ناول اور ناول نگار جنکے طرز بیان سے اُردو کی شاعری اور اُردو کے
ادب پر کوئی مفید اور دلچسپ اثر پڑ سکتا ہے اور اُن کے پسندیدہ لفظوں اور قابل
قدر ادائے کلام سے ناطقہ افروزی کیجا سکتی ہے۔ میرے نزدیک اکثر ناولوں میں
لفظوں کو اس سلیقے سے بٹھایا اور لفظوں کو جوڑ کر اس دلچسپی سے فقرہ بنایا گیا
ہے جو بہت قابل قدر ہے۔

خواتین شاعرہ

علیا حضرت نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال

واضح ہو کہ راقم الحروف کو بھوپال میں بائیس برس ملازمت کا تعلق رہا۔ اور سالہا
سال علیا حضرت نواب شاہ جہان بیگم صاحبہ جنت آرام والیہ سابق ریاست
بھوپال کے حضور میں باریابی کا فخر حاصل رہا ہے۔ حضور ممدوحہ کا مذاق نہایت
شاہانہ تھا۔ آنکی لائف کو جداگانہ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ حضور ممدوحہ کو
شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اور استعداد علمی بھی رئیسانہ درجہ میں بہت کچھ

بے تکلف باتیں کرتیں اور بات بات میں فوراً برجستہ اشعار کہنے سے حیرت انگیز کمال ظاہر کرتی ہیں اور اب اُردو شاعری کی ہمیشہ مشق جاری رہتی ہے۔ نظم میں بھی ان کو عربی فارسی زبان کا بھی علم ہے۔

اب منشا ہوں کہ جب علیگڑھ میں تعلیم نسواں کی ابتداء قائم ہونے کی تدبیریں ہو رہی ہیں تو جناب مسٹر شیخ عبداللہ صاحب نے خدیجہ بیگم صاحبہ کو بھوپال سے اپنی لڑکیوں کی خانگی تعلیم کو طلب فرمایا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سارے ہندستان میں ایسی مہذب اور غیور ادیبہ اور فاضلہ خاتون بہ نصیبی کو نہیں مل سکتی۔

ضیا

یہ بی بی مولوی نظام الدین صاحب کی ہمشیرہ ہیں اور بھوپال کی رہنے والی ہیں۔ شعر کہنے سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں اور اُردو شعر بے تکلف کہتی ہیں۔ بھوپال میں جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کے بذل و عطا سے مستفیض ہوتی رہی ہیں۔ کئی مرتبہ بھوپال آنے کا اتفاق ہوا۔

ضیا کو غزل اور قصیدہ دونوں میں قابل قدر سلیقہ حاصل ہے اور ضیاء کی شاعری سے مذاق علمی کا پتہ ملتا ہے۔

پس اگر اُردو کی ترقیخواہ جماعت اُردو کی لائبریری میں خواتین زمانہ قریب کو خاص جگہ دے تو وہ اُردو کی دلچسپی میں خاص اضافہ کرنے والی ہوگی۔

اب شاعری کی ضرورت نہیں

موسیقی اور شاعری اسی وقت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جب قوم ہر طرح سے آسودہ اور فارغ البال اپنے اقبال و ترقی کے مزے لے رہی ہو۔ اس کے قلوب شگفتہ و شاداب ہوں اس کی قدردانی اور داد سخن کے لئے کافی دولت پاس رکھتی ہو۔ اس کی سوسائٹی کے آزادی اور تنعم میں خوف مایوسی۔ پریشانی۔ پژمردگی۔ افسردہ دلی کا نام نہ ہو۔ برخلاف اسکے ہماری قوم تمام دنیا میں اس خیال کا مصداق نظر نہیں آتی۔ اور ہمارا قومی ستارہ جو نصف النہار پر تھا اور دیکھتے دیکھتے

تھا وہ بشر واقع ہنگ پیچھے کو اثر رہا ہے ۵ جلیل

ستم ہے مبتلائے عشق ہو جانا جواں ہو کر — ہمارے باغ ہستی میں بہار آئی خزاں ہو کر
یہی عالم ہے گر جوش جنوں میں خاک اڑانے کا — زمیں بھی سر پہ آ کر دن آفت کی آسماں ہو کر
وہ بت محو خرام ناز ہے آئینہ خانے میں — تماشا ہے کہ یوسف پھر رہا ہے کارواں ہو کر
بڑھاپا پیچ کا تیری جوانی دونوں قاتل ہیں — ستمگر تو بنا ہے تیر ہو کر وہ کماں ہو کر
ہمیں وہ تھے کہ ہوتی تھی بسر پھولوں کے غنچے پر — ہمیں اب ہو فلک تنکے چنیں بے آشیاں ہو کر
نہال شمع میں کیا خوشنما اک پھول آیا تھا — ستم ڈھایا نسیم صبح نے باد خزاں ہو کر

اسلئے آجکل کسی کو شاعر بننے کی ہدایت کرنا یا کسی کو شاعر ہونے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو ہنسوانا اور شاعری کو ذلیل کرنا ہے اور جو عام قلوب کو موسیقی کی طرح نظم کے ساتھ خاص دلچسپی ہے وہ شاعری کے بدلے صرف نظم سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن جیسے موسیقی میں معمولی لوگوں کو دادرے۔ لاونی اچھے معلوم ہوتے ہیں جو موسیقی کا معیار کمال نہیں بلکہ وہ معیار دُھرپد۔ ترانہ وغیرہ میں پایا جاتا ہے ویسے ہی نظم کی عام دلچسپیاں شاعری کے خاص مقامات کے ہم مرتبہ نہیں ہو سکتیں۔ اور ایشیائی سوسائٹی کے علمی مذاق اور اُسکی یادگار سلسلوں کا قائم رکھنا ضرور ہے۔ اس لئے ہمکو اتنا سادہ اور بے شعور نہ ہونا چاہیئے جو شاعری کے اعلےٰ مقامات کو بالکل بھول جائیں اس لئے اگر ہم شاعرین کو شاعری کی لذتیں وہ صورتیں نہیں دکھا سکتے تو شعرائے متقدمین کے نکات کو بطور واقعہ فراموش کرنا نہ چاہیئے اور وہ صورتیں مولانا روم۔ دیوان حافظ۔ دیوان صائب۔ شاہنامہ۔ کلیات خاقانی اور اردو کے معتبر سخن طرازوں میں غالب مرحوم وغیرہ کے مرقع جات دیکھنے سے یاد رہ سکتی ہیں۔ اور عام دلچسپی کے لئے اس زمانہ کی اردو نظموں سے دل بہلانا اور کبھی موزون طبعی سے نئے نظم لکھنے کی کوشش کرنا کافی ہوگا۔

میر انیس کا انداز سخن طبیعت کی روانی کو عجیب رہنمائی کر سکتا ہے۔ اردو نظم سے زمانہ کی عام ضرورتیں پوری کیجا سکتی ہیں۔ فقط